اپریل

2021ء

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

لندن

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" اور "اُردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی و مذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

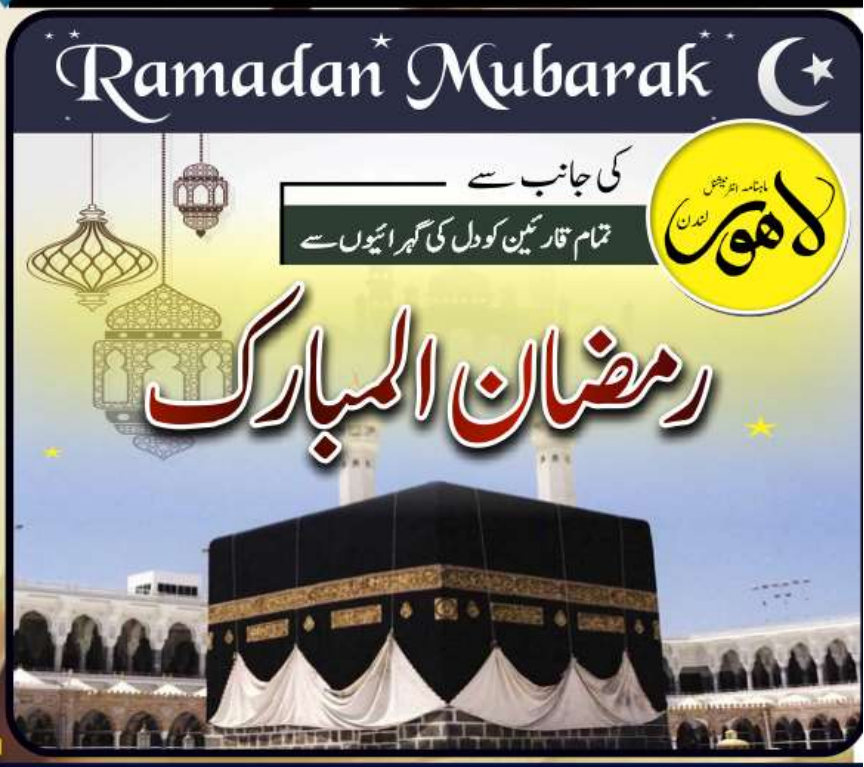

www.YouTube.com/lahoreinternational

Your favourite Monthly Magazine

Lahore International is relaunching its YouTube Channel

Subscribe now for great content!!

Where we go deep into the streets of Pakistan to bring you exclusive enjoyable content.

Head over to YouTube and check it out

ZINGMAAR

EASY TO FOLLOW
UNIQUE RECIPES FROM
AROUND THE WORLD

FOLLOW @ZINGMAAR

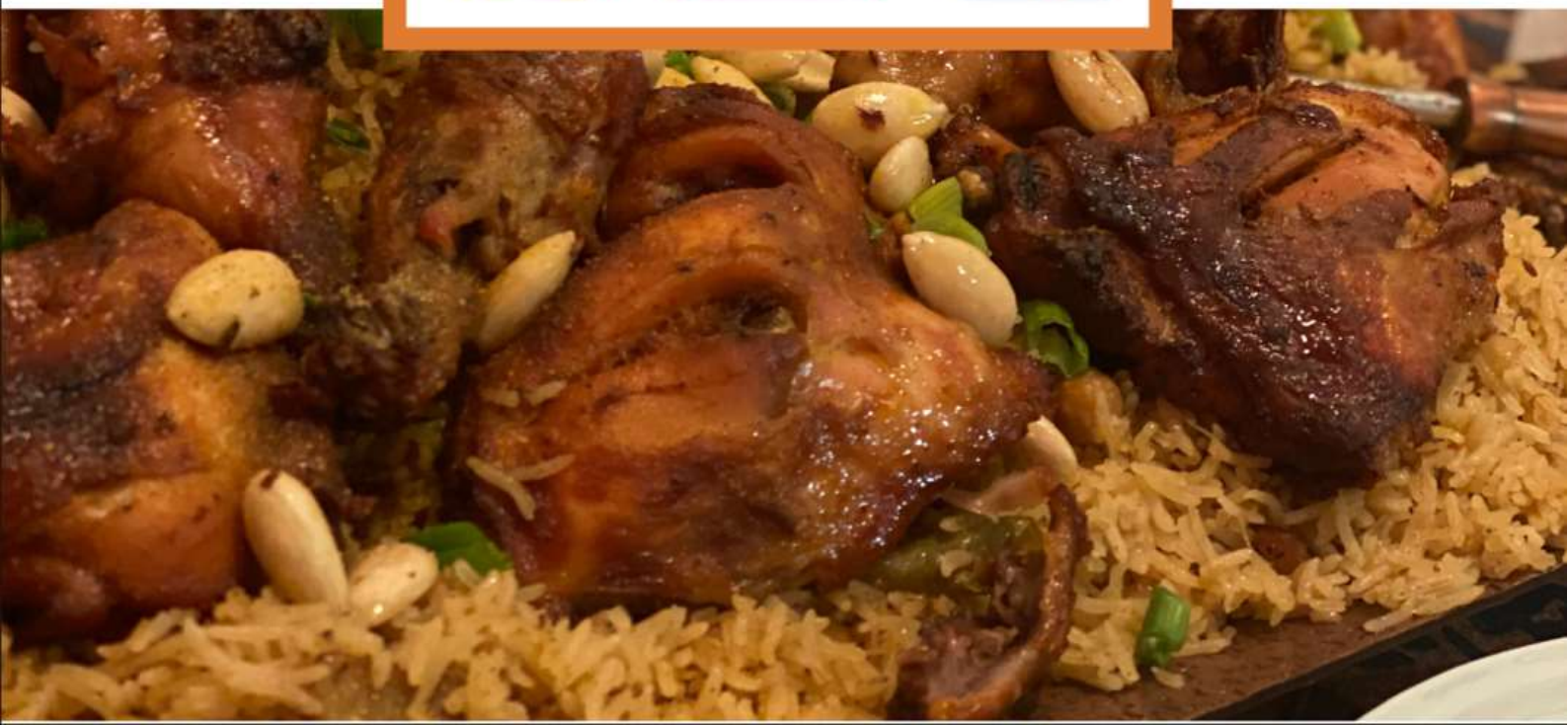

ھُوَالناصر
خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ

بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمرم — گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 6 شمارہ نمبر: 04 رمضان 1442 اپریل 2021ء

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
ظہیر الدین عباسی (جرمنی)
محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
عابد شمعون چاند (سعودی عرب)
علی حسنین مسعود (بیورو چیف سینٹرل پنجاب)
انس احمد (بیورو چیف لاہور)
ابن الامین (برطانیہ)
بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
رحمت اللہ میر بلوچ (بیورو چیف بلوچستان)
محمد ثناء اللہ (بیورو چیف وسطی پنجاب)
چوہدری مقبول احمد (بھارت)

قیمت فی شمارہ: 3 پاؤنڈ

اس شمارہ میں

درس قرآن کریم 04
رمضان المبارک اور اس کی برکات 05
شمعِ جمہوریت و مادرِ ملت فاطمہ جناح رحمۃ اللہ علیہ 07
جب عمران خان نے بوتھم سے کیس جیتا 09
اچھا خاصا جی تو رہا ہوں 11
عورت مارچ: حقوق کا مطالبہ کس سے اور کیوں؟ 12
تالپور حکمرانوں کا تعمیراتی شاہکار ''فیض محل'' 15
چائے، پکوڑے اور انصاف 16
کیا ہمارے معاشرے میں صنفی امتیاز موجود ہے؟ 17
ڈاکٹر جنرل (ر) مسعود الحسن نوری صاحب کے سنگ انمٹ نقوش سے بھرپور ''قلعہ نندنہ'' اور ''یادگار اسکندرِ اعظم'' کی سیر 18
ہفت روزہ لاہور کا اجراء ثاقب زیروی کی زبانی 20
بس اپنے حصے کی شمع جلانے کی ضرورت ہے۔ 26
معلم کا رویہ 28
ایس۔اے۔صہبائی 29
ظفر اللہ خان کاش سب لوگ تمہاری طرح ہوں 30
کشمیر... انسانی المیہ 31
سرکس کے شور میں دبے مقدمات 34
سول سروٹس قواعد 1964ء میں تبدیلیاں 37
بھارتی سپریم کورٹ میں قرآن کریم سے متعلق دائر کی گئی درخواست اور ہمارا ردعمل 38
آج وساکھی کا تہوار ہے 41
تاریخ کا ایک دردناک باب 43
شہزادہ ہیری و میگھن مارکل کے انٹرویو کی دنیا بھر میں گونج 44
کیا بائبل کی ہجرت عظیم کی داستان ایک افسانہ ہے؟ 45
انڈیا کی ریاست آندھرا پردیش میں گدھے کے گوشت کی مانگ میں اضافہ کیوں؟ 46
مورمن مذہب کی مختصر تاریخ 47
برطانیہ سابق سیاستدان کی جانب سے لوٹے گئے 58 لاکھ ڈالر نائیجیریا کو واپس کرے گا 49
کیمیائی ہتھیاروں کی اقسام 53
بھارتی مسلمانوں کی سیاسی ناکامی 55
جنگ آزادی مئی ۱۸۵۷ء اور میو قوم 56
دنیا کی تاریخ کا سب سے ظالم بادشاہ 59
مخدوم محمد زمان ؒ طالب المولیٰ ؒ 60

website : lahoreinternational.com
اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:
lahoreintlondon@gmail.com
m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ لاہور میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

ADVERTISEMENT TARIFF
(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

درس قرآن کریم

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا O

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا O

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا O (سورۃ بنی اسرائیل آیت 16 تا 18)

ترجمہ: جو ہدایت پا جائے وہ خود اپنی جان ہی کے لئے ہدایت پاتا ہے اور جو گمراہ ہو تو وہ اسی کے مفاد کے خلاف گمراہ ہوتا ہے۔ اور کوئی بوجھ اُٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ نہیں اُٹھائے گی۔ اور ہم ہرگز عذاب نہیں دیتے یہاں تک کہ کوئی رسول بھیج دیں (اور وہ حجت تمام کر دیں)۔

اور جب ہم ارادہ کر لیتے ہیں کہ کسی بستی کو تباہ کر دیں تو اُس کے خوشحال لوگوں کو حکم دے دیتے ہیں (کہ من مانی کارروائیاں کرتے تھے پھریں) پھر وہ اس میں فسق و فجور کرتے ہیں تو اس پر فرمان صادق آ جاتا ہے تو ہم اس کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں۔

اور کتنے ہی زمانوں کے لوگ ہیں جنہیں ہم نے نوح کے بعد ہلاک کیا اور تیرا رب اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے (اور) اُن پر نظر رکھنے کے لحاظ سے بہت کافی ہے۔

ماہنامہ انٹرنیشنل

تفسیر: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا : مسند احمد بن حنبل میں کچھ ایسی حدیثیں ہیں جن سے عوام ناواقف ہیں۔ فرمایا جو لوگ بہرے ہیں یا جنہوں نے انبیاء و رُسل کا زمانہ نہیں پایا۔ یا وہ بچے تھے یا بہت بوڑھے تھے۔ یہ جنابِ الٰہی میں اپنے اپنے عُذر پیش کریں گے کہ ہمیں کچھ خبر نہ تھی۔ وہاں بھی اللہ تعالیٰ رسول بھیج دے گا۔ بغیر رسول کے عذاب نہیں دیا جاتا۔ ابنِ جریر میں بھی ایسی حدیثیں ہیں۔

فَفَسَقُوْا فِيْهَا : وہ جن کو حکم دیا جاتا ہے ہمارے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ : بدیاں کرتے کرتے وہ حالت پہنچ جاتی ہے۔ جس پر فردِ جرم لگ جائے۔

وَكَفٰى بِرَبِّكَ : نحو کا نقطہ آپ کو سُنائے دیتا ہوں۔ كَفٰى بِرَبِّكَ کے معنے کہتے ہیں۔ كَفٰى رَبُّكَ ہیں۔ پس كَفٰى رَبُّكَ کیوں ہوا۔ یہ ب کیوں بڑھی؟

(علمِ نحو کی لغوی تعریف یہ کہ یہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے اس، فعل، حرف کے آخر کو معرب اور مبنی کے اعتبار سے اور بعض کلمات کو بعض سے ملانے کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔)

نحویوں نے لکھا ہے کہ جب مدح یا ذم کا کوئی مقام ہوتا ہے تو پھر ایک جملہ کے دو جملے بنا لیتے ہیں۔ اِكْتَفِ بِرَبِّكَ تُو کفایت کر اپنے ربّ سے۔ كَفٰى رَبُّكَ قَامَ بِاَخِيْكَ مدح کے مقام میں بولیں گے۔ (حقائق الفرقان جلد دوم صفحہ 527-528)

تفسیر: سورۃ القلم میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ ہم جب انبیاء کے دشمنوں کو مہلت دیتے ہیں تو اس لیے دیتے ہیں کہ ان کے گناہ کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور پھر اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے ان کو کوئی بچا نہیں سکتا۔ اس سورت میں بیان قوموں کا ذکر ہے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار مہلت دی گئی لیکن جب ان کے گناہوں کا پیمانہ بھر گیا تو ان کی پکڑ کی گھڑی آ گئی۔ (اُردو ترجمہ قرآن صفحہ 1066)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جس بہت بڑے عذاب سے بنی نوع انسان کو ڈرانے کا ارشاد فرمایا ہے اس کا تعلق دنیا کی کسی خاص مذہبی جماعت سے نہیں بلکہ بحیثیت انسان ہر ایک کو متنبہ کیا گیا ہے۔ جب وہ واقعہ ہوگا تو دنیا کے لحاظ سے بھی انسان سمجھے گا کہ گویا زمین و آسمان اس پر پھٹ پڑے ہیں انسان کی بعثتِ ثانیہ میں بھی یہ انتباہ ایک دفعہ پھر پورا ہوگا کہ نہ اس کا کوئی زمینی تعلق اسے بچا سکے گا نہ آسمانی تعلق اور جہنم اس کا انجام ہوگا۔ (قرآن کریم اُردو ترجمہ صفحہ 1066)

مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

اداریہ

رمضان المبارک اور اس کی برکات

رمضان المبارک اپنی پوری برکتوں کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔ اس مبارک مہینہ میں خدا تعالیٰ اپنے خاص افضال اور برکات نازل فرماتا ہے۔ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سنتا ہے اور ان کی حاجتوں اور ضرورتوں کو پورا فرماتا ہے اور انہیں قرب خاص سے نوازتا ہے۔

روزہ اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ روزہ عبادت ہے جس سے انسانی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے روزہ کی اہمیت کے سلسلہ میں بیان فرمایا ہے کہ سارے مذاہب اور تمام شرائع میں روزہ فرض ہوتا رہا ہے۔ گویا روزہ سارے مذاہب کی ایک مشترکہ اور بنیادی عبادت ہے۔ اسلام میں جو روزہ کی شکل ہے وہ کامل ہے اور اسے کامل روحانی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ تندرست اور مقیم ہونے والے ہر بالغ مرد اور عورت پر فرض ہے کہ وہ رمضان کے مہینہ میں طلوعِ فجر سے لے کر غروبِ آفتاب تک کھانے پینے وغیرہ سے اجتناب کرے۔ خدا کے حکم کے مطابق دن بھر بھوکا اور پیاسا رہے اور ذکر الٰہی میں مشغول رہ کر دن بسر کرے۔ اس طرح روزہ داروں کو احساس ہوگا کہ ان کے غریب بھائی سال بھر کس طرح بھوک کی سختیاں برداشت کرتے ہیں۔ ان محتاجوں کے لئے ہمدردی پیدا ہوگی اور وہ اپنے بنی نوع بھائیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی طرف خاص طور پر توجہ کریں گے۔ اس عمدہ احساس کے ساتھ ساتھ کھانا پینا ترک کرنے سے ان کی روحانی قوتوں میں بیداری پیدا ہوگی اور وہ روح کی طرف زیادہ توجہ دے سکیں گے۔ انہیں پتہ چلے گا کہ جس طرح کھانے اور پینے کے بغیر جسم کا بقاء ناممکن ہے اسی طرح روحانی غذا کے بغیر روح کی زندگی اور نشوونما بھی ممکن نہیں۔ اسی طرح روزہ اجتماعی اور انفرادی طور پر بہت سی برکات لاتا ہے۔ رمضان المبارک سے اسلامی معاشرہ میں ایک پاک تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اور ایک ماہ کی یہ روحانی تربیت سال بھر کے لیے عموماً روحانی خوراک کا کام دیتی ہے۔ کیونکہ سحری کے لئے عورتیں اور مرد اٹھتے ہیں اس لیے رمضان کے ایام میں نمازِ تہجد کا اہتمام بھی آسانی سے ہوتا ہے۔ اسی طرح مسلمان پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ رمضان کے مبارک مہینہ میں تہجد کی نماز کی برکات سے بھی عام طور پر مستفید ہوتے ہیں۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس نے ایک طرف فطرتی قویٰ کی روحانی طاقتوں کو اُبھارنے کے لیے مختلف عبادتیں مقرر فرمائی ہیں تو دوسری طرف یہ بھی حکم دیا ہے کہ کسی انسان پر اس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔ اس لئے جو لوگ رمضان میں مسافر ہوں یا بیمار ہوں ان کو ان ایام میں روزہ رکھنے سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ شریعت کی دی ہوئی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا مناسب ہے مگر دین کی سہولتوں کے باوجود جو لوگ فرض روزہ نہیں رکھتے وہ سخت گنہگار ہیں۔ انہیں اس زندگی کے بعد سخت افسوس ہوگا کہ ہم نے قیمتی مواقع ضائع کر دیئے۔ پس مومنوں کا فرض ہے کہ ہر قسم کی افراط وتفریط سے بچتے ہوئے شریعتِ اسلامی کے قانون کی پیروی میں رمضان المبارک کے روزے رکھ کر اس بابرکت مہینہ کی برکتوں سے وافر حصہ حاصل کریں۔

''آخری عشرہ اور لیلۃ القدر''

رمضان کے آخری عشرہ کے بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے یہ چند فضائل ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنتِ رسول ﷺ کی رُو سے کہ ہمیں یہ عشرہ کس طرح گزارنا چاہیے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آخری عشرہ میں آنحضرت ﷺ ایسی عبادت کرتے تھے جو کبھی دوسرے دنوں میں نہیں دیکھی۔ ان کیفیات کو بیان کرنا انسان کی طاقت میں نہیں ہے۔ آپ ﷺ ذکرِ الٰہی میں اپنے آپ کو گم کر دیا کرتے اور خیر کے جتنے بھی اعلیٰ پہلو ہیں مال کے علاوہ ان سارے پہلوؤں میں آنحضرت ﷺ میں ایسی تیزی آئی ہوتی جیسے آندھی جھکڑ چل رہا ہو۔ بس یہ تیزی ذکرِ الٰہی کی تیزی تھی، خدا کی ذات میں ڈوب جانے کی تیزی تھی۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ سے متعلق آخری عشرہ سے بڑھ کر خدا تعالیٰ کے نزدیک عظمت والے اور محبوب اور کوئی دن نہیں ہیں۔

لیلۃ القدر

رمضان المبارک کی ایک مقدس رات جس کا نام لیلۃ القدر ہے۔ یہ رات بڑی برکتوں ورحمت والی اور اہمیت وعظمت والی ہے۔ اس کا بڑا اہم مقام ومرتبہ ہے۔ قرآن واحادیث اور بزرگانِ دین کے واقعات کی روشنی میں لیلۃ القدر کے لغوی معنی یہ ہیں جو لغتِ عرب کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ (1) قسمت والی رات (2) حرمت والی رات (3) قوت والی رات (4) وقار والی رات (5) سہولت والی رات اور تقدیر کی رات۔ لیلۃ القدر کے اصطلاحاً معنی ہیں: رمضان المبارک کی وہ رات جس میں قرآنِ کریم کے نزول کی ابتداء ہوئی۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ انّا انزلناہ في لیلۃ القدر (سورۃ القدر:2) یقیناً ہم نے اسے لیلۃ القدر میں نازل کیا ہے۔

پھر فرمایا: وما ادرٰك ما لیلة القدر (سورۃ القدر:3) اور اے مخاطب! تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ عظیم الشان رات جس میں تقدیریں اترتی ہیں۔ کیا شے ہے۔ آیت نمبر 2 کا مطلب یہ ہے کہ نبی کا زمانہ رات کی طرح ہوتا ہے مگر رات بھی ایسی جس میں آئندہ زمانہ کے متعلق خدا تعالیٰ کے فیصلے اترتے ہیں۔ یعنی آئندہ زمانہ میں جو کچھ اس دنیا میں پیش آنے والا ہے وہ اس قرآن میں بیان کر دیا ہے۔ (حوالہ تفسیر صغیر صفحہ 836۔ حضرت فضل عمر) رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے ایک رات جس میں اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے لئے خاص اپنی تجلی فرماتا ہے اور ان کو اندھیروں سے روشنی میں بدل دیتا ہے۔ جس طرح رمضان قرآن کے نزول کا مقدس مہینہ ہے اسی طرح یہ خاص رات آغازِ نزولِ قرآن کی رات ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن کی رات کو برکت والی رات قرار دیا اور فرمایا: انّا انزلنہ فی لیلة مبارکة (سورۃ الدخان:4) یعنی ہم نے اس قرآن کو ایک برکت والی رات میں نازل کیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم نے سورۃ الدخان 5 میں لیلۃ القدر کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا: فیھا یفرق کل امر حکیم یعنی کہ اس رات میں ہر حکمت والی بات اور امر کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ گویا یہ فیصلوں کی رات بھی ہے۔ اس لیے اسے دعاؤں اور عبادت کے ساتھ گزارنا چاہیے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہمارے حق میں ہوں اور پھر ان پر دوام اختیار کرنا چاہیے۔

لیلۃ القدر رمضان کی کس تاریخ کو آتی ہے: اس کے متعلق متعدد متفرق روایات ہمیں ملتی ہیں۔ ایک تو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی رات ہو سکتی ہے یعنی رمضان کی 27، 25، 23، 21 یا 29 ویں رات مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس رات کی تاریخ کو معین نہیں فرمایا۔ یہ قدر کی رات مختلف سالوں میں مختلف ملکوں میں اور افراد کے لیے مختلف تاریخوں پر بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وسعتِ دنیا اور فرقِ اُفق کی وجہ سے بعض ممالک ایک دن پہلے روزہ شروع کر دیتے ہیں کوئی دو دن پہلے۔ اس طرح ان ملکوں کی طاق راتیں اکٹھی ہو ہی نہیں سکتی۔

لیلۃ القدر کی پہچان: بعض روایات بزرگانِ امت کی تحریر کے مطابق رات کو بارش ہوتی ہے۔ ہوا چلتی ہے۔ اور زمین و آسمان کے درمیان نور کی لہر نظر آتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی روحانی کیفیت کو تمام لوگ ایک ہی بار یا ہر کوئی دیکھ سکے۔

کیونکہ یہ ایک روحانی کشفی نظارہ ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ لوگ ہر رات کے انتظار اور تلاش میں ہی رہتے ہیں مگر بغیر کسی ظاہری تجلی کے سارا رمضان گزر جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ پورے اخلاص و وفا کے ساتھ روزے رکھے۔ اور سارا رمضان خلوصِ نیت کے ساتھ دعاؤں میں لگا رہے۔ نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ تاکہ اس کو کسی وقت لیلۃ القدر کی تجلی نصیب ہو جائے۔

لیلۃ القدر کے لیے خاص دعا: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ یہ رات لیلۃ القدر ہے تو میں اس میں کیا دعا مانگوں؟ جس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ یوں دعا کرنا۔ ترجمہ:۔ کے اے میرے اللہ تو عفو و بخشش والا ہے۔ عفو و بخشش کو پسند کرتا ہے۔ پس تو مجھ سے بھی عفو و درگزر کا سلوک فرما۔ (جامع ترمذی کتاب الدعوت)

قیام لیلۃ القدر من الایمان: لیلۃ القدر میں تہجد کے لیے اٹھنا بھی ایمان سے ہی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول کریم ﷺ فرماتے تھے۔ جو لیلۃ القدر میں ایمان کی وجہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر اٹھتا ہے تو جو بھی گناہ اس کے پہلے ہو چکے ہیں ان سے اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ (صحیح بخاری باب 25 حدیث نمبر 35) امام بخاریؒ نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ لیلۃ القدر کی گھڑی پانے کی خاطر جس میں دعا قبول ہوتی ہے۔ نماز تہجد کے لیے اٹھنا خدا تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ خوشی دل سے رمضان میں تہجد کے لیے اٹھنا رمضان کے روزے رکھنا یہ سب باتیں ایمان کی ہی وجہ سے میسر ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں فرماتا ہے کہ لیلۃ القدر ہزار مہینے سے بھی بہتر ہے۔ لہٰذا یہ ہزار مہینوں کے 83 سال اور چار ماہ ہفتے ہیں جو ایک انسان کی مناسب عمر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا لیلۃ القدر انسان کی ساری عمر سے بہتر ہے۔ کیا ہی وہ خوش نصیب ہے وہ انسان جس کو اپنی زندگی میں لیلۃ القدر میسر آ جائے۔ اللہ کرے ہمیں اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں میں یہ روحانی رات نصیب ہو جائے اور ہم ہمیشہ کے لئے عباد الرحمان میں داخل ہو جائیں۔ آمین

رمضان المبارک کے ختم ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ نے شوال کی پہلی تاریخ کو مسلمانوں کو عید منانے کا حکم فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رمضان کی عبادت ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ آپ ﷺ نے اس خوشی کے اظہار کے لئے تمام مسلمانوں کو کسی کھلی جگہ پر جمع ہو کر دو رکعت نماز ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور پھر اس نماز کے بعد جائز طور پر خوشی منائی جائے اس دن روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی ہے البتہ عید الفطر کے اگلے دن یعنی دو شوال کو "دشش عید" کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس کے چھ روزے ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ ان روزوں کا بھی اہتمام کیا کرتے تھے اور اس کا بڑا ثواب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور ہماری نسلوں کو یہ تمام برکتیں اور خوشیاں جو رمضان سے متعلق ہیں عطا فرمائے اور آئندہ بھی ایسی ہزار نعمتوں کا وارث بنائے۔ آمین ثم آمین

شمعِ جمہوریت و مادرِ ملت فاطمہ جناح رحمۃ اللہ علیہ

تحریر: رانا اعجاز

تحریک پاکستان میں مادر ملت فاطمہ جناحؒ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، آپ نے جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کے لئے برصغیر کی مسلم خواتین کو بیدار کیا اور انہیں منظم کر کے ان سے ہراول دستے کا کام لیا۔ آپ ہی کی بدولت برصغیر کے گلی کوچوں میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی تحریک قیام پاکستان میں سرگرم ہوئیں۔ اسی پر اکتفاء نہیں بلکہ آپ نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کی خدمت اور تحریک پاکستان میں عملی طور پر حصہ لے کر عظیم خدمات سرانجام دیں۔ جوں جوں قیام پاکستان کی منزل قریب آرہی تھی قائداعظمؒ پورے ملک کے دورے کر رہے تھے، اس موقع پر آپ ان کے ساتھ ساتھ ہوتیں، بھائی کو اگر امت مسلمہ کی محرومی وغلامی بے چین کئے رکھتی تھی تو بہن اس عظیم بھائی کے بے چین دل کو سکون و راحت پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتی تھی۔

آپ نے دن رات قائداعظمؒ کے آرام وسکون کا خیال رکھا، قائداعظمؒ جدوجہد آزادی میں اس قدر مصروف تھے کہ انہوں نے اپنی گرتی ہوئی صحت کی بھی پروانہ کی، اس وقت محترمہ فاطمہ جناحؒ ان کی گرتی ہوئی صحت کیلئے بے حد فکر مند رہتیں اور بھرپور خیال رکھتیں، یہاں تک کہ محمد علی جناحؒ مکمل توجہ کے ساتھ تمام امور سرانجام دینے میں کامیاب رہے۔ محترمہ سیاسی بصیرت میں اپنے بھائی قائداعظمؒ کی حقیقی جانشین تھیں، ایک ایسی بہن جس نے اپنی زندگی کو بھائی کی خدمت اور تحریک آزادی کے لیے وقف کر دیا تھا، جو قوم کی ماں کا لقب ''مادر ملت'' حاصل کر کے سرخرو ہوئیں۔ ممتاز صحافی مجید نظامی مرحوم نے ایک محفل میں فرمایا تھا کہ ''مادر ملت کا شمار پاکستان بنانے والوں میں ہوتا ہے۔ آپ نے پیرانہ سالی کے باوجود قائداعظمؒ کا بھرپور ساتھ دیا اور ان کی دیکھ بھال کی، اگر آپ یہ خدمات انجام نہ دیتیں تو شاید پاکستان معرض وجود میں نہ آتا''۔

ایک موقع پر خود قائداعظمؒ نے اپنے سیکرٹری کرنل برنی سے اپنی عظیم بہن محترمہ فاطمہ جناحؒ کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''وہ اپنی بہن کی سالہا سال کی پرخلوص خدمات اور مسلمان خواتین کی آزادی کیلئے انتھک جدوجہد کی وجہ سے ان کے انتہائی مقروض ہیں۔'' ایک اور موقع پر قائداعظمؒ نے اپنی بہن محترمہ فاطمہ جناحؒ کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''جن دنوں مجھے برطانوی حکومت کے ہاتھوں کسی بھی وقت گرفتاری کی توقع تھی تو ان دنوں میری بہن ہی تھی جو میری ہمت بندھاتی تھی۔ جب حالات کے طوفان مجھے گھیر لیتے تھے تو میری بہن میری حوصلہ افزائی کرتی۔'' محترمہ فاطمہ جناحؒ کی سیاسی خدمات کا اعتراف ان کے بھائی قائداعظم محمد علی جناحؒ کی زبان سے ہونے کے بعد مزید کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ نے مسلم لیگ کی مالی اعانت کے لئے خواتین سے کہا کہ وہ مینا بازاروں کا انعقاد کریں، اس طرح آپ کی تحریک پر مسلم خواتین نے مینا بازار لگانے شروع کر دیئے۔ ان مینا بازاروں سے جو آمدن ہوتی تھی وہ مسلم لیگ کے فنڈ میں جمع کروادی جاتی تھی۔ اپریل 1944ء میں محترمہ فاطمہ جناح نے لاہور میں ایک مینا بازار کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ ''مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ لوگوں نے ایک مینا بازار قائم کیا ہے، اس طرح عورتیں بھی اپنے مسلمان بھائیوں کا ہاتھ بٹا سکتی ہیں اور ہمارا یہ فرض ہے کہ قوم کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کیلئے ہم ان کی مدد کریں، ہاتھ بٹائیں اور حوصلہ افزائی کریں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ ہماری بہنیں قوم کی اقتصادی حالت سدھارنے کیلئے ان کی مدد کریں گی''۔ قائداعظمؒ کی زندگی میں مادر ملت ان کے ہمراہ موثر طور پر 19 سال رہیں یعنی 1929ء سے 1948ء تک اور وفات قائدؒ کے بعد بھی وہ اتنا ہی عرصہ بقید حیات رہیں یعنی 1946ء سے 1967ء تک لیکن اس دوسرے دور میں ان کی اپنی شخصیت کچھ اس طرح ابھری اور ان کے افکار و کردار کچھ اس طرح نکھر کر سامنے آئے کہ اس سے عصری سیاست و معاملات پر ان کی ذہنی گرفت ناقابل یقین حد تک مکمل اور مضبوط تھی۔ 1965ء کے صدارتی انتخاب کے موقع پر ایوب خاں کی نکتہ چینی کے جواب میں مادر ملت نے کہا تھا کہ ''ایوب فوجی معاملات کا ماہر تو ہوسکتا ہے لیکن سیاسی فہم وفراست میں نے قائداعظمؒ سے براہ راست حاصل کی ہے اور یہ ایسا شعبہ ہے جس میں آمر مطلق نابلد ہے''۔ اور پھر وقت اجل آپہنچا، وہ 8 اور 9 جولائی 1967ء کی درمیانی شب تھی جب محترمہ فاطمہ جناحؒ سابق وزیر اعلیٰ حیدرآباد دکن لائق علی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے بعد گھر واپس لوٹیں تو گھریلو ملازم سلیم کے بیان کے مطابق محترمہ اس روز بھی حسب معمول بہت خوش تھیں، انہوں نے کہا کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گی لیکن کچھ پھل کھائے اور پھر قصر فاطمہ کی بالائی منزل پر سونے چلی گئیں، محترمہ کا اصول تھا کہ وہ روز صبح اٹھ کر چابیاں نیچے برآمدے میں پھینکا کرتیں تھیں جس سے ملازم کمروں کے تالے کھولتے۔ 9 جولائی کے روز مقررہ وقت تک چابیاں نہ آئیں

تو گھر کا ملازم پریشان ہوا، اس کو تشویش لاحق ہوئی اسی اثنا میں ان کی دھوبن بھی پہنچ گئی جس نے کہا کہ خدانخواستہ محترمہ کی طبیعت خراب نہ ہو، وہ فوری بھاگتی ہوئی قصر فاطمہ کے نیچے والے کمرے میں گئی جہاں چابیوں کا گچھا تھا، اتفاقاً ان میں سے ایک چابی محترمہ کے کمرے کو لگ گئی، دیکھا تو محترمہ اس دنیا دار فانی سے رخصت ہو چکی تھیں۔

اس طرح 9 جولائی 1967ء کو محترمہ فاطمہ جناح مختصر علالت کے بعد 73 برس کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ سبز ہلالی پرچم میں جب ان کا جسد خاکی قصر فاطمہ سے پولو گراؤنڈ پہنچا تو وہاں پہلے سے ہی لاکھوں افراد کا مجمع موجود تھا جبکہ مزید لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، جوان، بوڑھے، بچے اور خواتین زار و قطار اپنی مملکت کی ماں کا آخری دیدار کرنے کو ترس رہے تھے۔ تقریباً 12 بج کر 35 منٹ پر ایچ خورشید اور ایم اے ایچ اصفہانی نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے محترمہ کی میت کو قبر میں اتارا تو اس وقت لوگوں کی تعداد تقریباً 6 لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی اور ہر آنکھ اشکبار تھی۔ یوں محترمہ فاطمہ جناحؒ لاکھوں سوگواروں اور قوم کو یتیم کر کے منوں مٹی تلے سو گئیں۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ کو ان کی وصیت کے مطابق مزار قائد میں ہی دفن کیا گیا ان کی قبر سردار عبدالرب نشتر اور لیاقت علی خان کی قبروں کے درمیان، قائداعظم محمد علی جناحؒ سے تقریباً 120 فٹ کے فاصلے پر ہے۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ کی موت آج تک ایک معمہ بنی ہوئی ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ محترمہ کی موت طبعی نہیں تھی بلکہ انہیں قتل کیا گیا تھا۔ مادر ملتؒ کی قومی خدمات کے صلے میں پاکستانی عوام اپنی اس ماں کو بطور محسن ملت ہمیشہ یاد رکھے گی۔

نوٹ: ادارے کا قلمکار کے خیالات اور پیش کردہ مندرجات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

دینا واڈیا کون تھیں؟

تحریر: عمران اسماعیل

قائداعظم نے ایک پارسی خاندان کی خاتون رتی بائی (مریم جناح) کے ساتھ شادی کی تھی، شادی کے ایک سال کے بعد 15 اگست 1919ء کو لندن میں ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئیں جن کا نام دینا جناح رکھا گیا، دینا جناح بانی پاکستان کی اکلوتی اولاد تھیں۔

دینا جناح نیول واڈیا سے منسوب ہونے کی وجہ سے بعد ازاں دینا واڈیا کہلائیں جو گزشتہ رات طویل علالت کے بعد 98 سال کی عمر میں امریکا کے شہر نیویارک میں انتقال کر گئیں، اُن کی پیدائش کے ٹھیک 28 سال بعد 14 اور 15 اگست کی درمیانی شب کو پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اِن کی والدہ مریم جناح 20 فروری 1929ء کو صرف 29 سال کی عمر میں وفات پا گئیں، اس وقت دینا جناح کی عمر صرف دس سال تھی۔ قائداعظم کی اہلیہ کے انتقال کے بعد قائداعظم نے اپنی اکلوتی بیٹی کی تربیت کرنے کی ذمہ داری اپنی بہن فاطمہ جناح کے سپرد کی اور اُنہیں تلقین کی کہ دینا کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دی جائے۔ بہر حال اُس وقت تحریکِ پاکستان بھی عروج پر تھی اور قائداعظم کی مصروفیت کا تمام محور آل انڈیا مسلم لیگ تھی، اسی وجہ سے فاطمہ جناح بھی ان کی تحریک کا حصہ تھیں۔ اس صورت حال کے باعث دینا جناح اپنے پارسی ننھیال سے زیادہ قریب ہو گئیں، اس دوران دینا جناح کی شادی کا سلسلہ چلا اور قائداعظم کو جب پتہ چلا کہ دینا جناح نے پارسی نوجوان نیول واڈیا سے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو قائداعظم نے اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں لاکھوں پڑھے لکھے مسلمان لڑکے ہیں تم ان میں سے کسی بھی مسلمان لڑکے کے ساتھ شادی کر لو، جواب میں بیٹی نے باپ سے کہا کہ ہندوستان میں لاکھوں خوبصورت مسلمان لڑکیاں تھیں لیکن آپ نے ایک پارسی لڑکی سے شادی کیوں کی؟

قائداعظم نے جواب میں کہا کہ تمہاری ماں نے شادی سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا لیکن ان کی بیٹی پر اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا اور اُنہوں نے بالآخر نیول واڈیا سے شادی کر لی، قائداعظم اس شادی میں شریک نہیں ہوئے اور وہ بیٹی سے سخت ناراض تھے، جس کا تفصیلی مکالمہ تاریخ کی کئی کتابوں میں محفوظ ہے۔ نیول واڈیا 22 اگست 1911ء کو لیورپول یوکے میں پیدا ہوئے اور اُن کا انتقال 31 جولائی کو ممبئی میں ہوا، وہ ایک بھارتی بزنس مین تھے۔ جب 1948ء میں قائداعظم کا انتقال ہوا تو دینا واڈیا ان کا آخری دیدار کرنے کے لیے کراچی آئیں، پھر وہ ممبئی سے نیویارک منتقل ہو گئیں۔ وہ آخری مرتبہ 2004ء میں پاک بھارت کے مابین کرکٹ میچ دیکھنے پاکستان آئیں اور اپنے والد کی آخری آرام گاہ مزار قائد پر بھی گئیں۔

شجرہ نسب

دینا واڈیا اور اُن کے شوہر نیول واڈیا کی واحد اولاد ان کے صاحبزادے نوسلی واڈیا ہیں جو 15 فروری 1944ء کو ممبئی میں پیدا ہوئے، وہ بھی اپنے والد کی طرح بزنس مین ہی ہیں۔ نوسلی واڈیا کے دو بچے ہیں، نیس واڈیا اور جہانگیر واڈیا، یہ دونوں بھی مشہور بھارتی بزنس مین ہیں، نیس واڈیا بیشتر کمپنیوں کے بورڈ آف ڈائریکٹر بھی ہیں اور انڈین پریمیئر لیگ کی ٹیم کنگز الیون پنجاب میں بھی ان کے شیئرز ہیں۔

جب عمران خان نے بوتھم سے کیس جیتا

آج کل سپریم کورٹ میں جناب جسٹس فائز عیسیٰ صاحب کا مقدمہ چل رہا ہے۔ جسٹس صاحب نے سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی اپیل کی ہوئی ہے۔ اس ضمن میں ان کی ایک درخواست سپریم کورٹ میں چل رہی ہے کہ نظر ثانی کیس کی سماعت لائیو نشر کرنے کی اجازت ہو۔ عدالت نے اس پر اپنا فیصلہ محفوظ کیا ہے، جلد ہی سنا دیا جائے گا۔ جسٹس فائز عیسیٰ کا میں بے حد احترام کرتا ہوں، قابل اعتماد شواہد کی بنیاد پر میری رائے ہے کہ وہ انتہائی دیانت دار اور بااصول جج ہیں۔ ایسا جج جس کے لئے معروف انگریزی اصطلاح Dead Honest استعمال کی جا سکے، جسے خریدنا یا جس کے فیصلوں پر اثر انداز ہونا ممکن نہیں۔ جج صاحب کے حدیبیہ ملز کیس سے کئی قانون دان اختلاف کرتے ہیں، مگر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ فیصلہ قانونی اعتبار سے غلط ہے۔ افسوس کہ اس کیس کے دوران کئی بار جج صاحب کو اپنے وکیل کے بجائے خود بولنا پڑا ہے، اس سے ان کے نیازمندان کو خوشی نہیں ہو رہی۔ عدالتوں میں غیر جذباتی، ٹو دی پوائنٹ دلائل دینا ہی مناسب رہتا ہے، پروفیشنل وکلاء اس ہنر سے بخوبی واقف ہیں، انہیں ہی یہ فرض نبھانے کا موقعہ دینا چاہیے۔ گزشتہ روز کیس کی سماعت میں جسٹس فائز عیسیٰ نے حوالہ دیا کہ آئن بوتھم نے عمران خان پر بال ٹمپرنگ کا کیس کیا اور عمران خان نے جوابی طور پر کیس کر کے جیت لیا۔ سوشل میڈیا میں اس پر پوسٹیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو کیس کی تفصیل سے آگہی نہیں۔ عمران خان بہت سے لوگوں کی طرح میرا بھی پسندیدہ کرکٹر رہا ہے، کرکٹ چھوڑنے کے بعد بھی ان سے متعلق خبریں ہم فالو کرتے رہے۔ یہ کیس بھی ان میں سے ایک ہے۔ کالم لکھنے سے پہلے دو تین گھنٹے نیٹ پر سرچ میں لگائے۔ وہ خبریں اور رپورٹیں مل گئیں جن میں کیس کا فیصلہ شائع ہوا تھا، ڈیلی موشن پر تین منٹ کی ویڈیو مل گئی، جس میں عمران خان جمائما خان کا ہاتھ پکڑے عدالت سے باہر آ رہے ہیں۔ انہوں نے رپورٹروں سے مختصر بات چیت کی اور اس کامیابی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ جمائما کا گلنار چہرہ دیکھ کر اچھا لگا، بڑے والہانہ انداز سے خاوند کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ افسوس کہ یہ جوڑی ٹوٹ گئی۔ عمران خان پر کیس آئن بوتھم اور ایلن لیمب نے کیا تھا، عمران نے اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بوتھم مشہور برطانوی آل راؤنڈر ہیں۔ ایک زمانے میں دنیا کے چار بڑے آل راؤنڈرز کا تذکرہ ہوتا تھا، نیوزی لینڈ کے رچرڈ ہیڈلی، برطانیہ کے آئن بوتھم، پاکستان کے عمران خان اور بھارت کے کپیل دیو۔ بہت سے ماہرین کپیل دیو کو اس فہرست میں شامل نہیں کرتے تھے اور اصل مقابلہ پہلے تین آل راؤنڈرز میں سمجھتے تھے۔ بطور فاسٹ باؤلر عمران خان نے بعض حیران کن سپیل کرا رکھے ہیں، وہ جینوئن فاسٹ باؤلر تھے اور ان کا اِن کٹر یا اِن شوٹر جسے رچی بینو اِن ڈیپر بھی کہتے تھے، کمال درجے کا تھا۔ گیند آف سٹمپ سے باہر پڑتی اور پھر سانپ کی طرح لہراتی ہوئی اندر داخل ہوتی تھی۔ سپیڈ کے ساتھ گیند کی کاٹ اتنی تیز اور گہری ہوتی کہ اچھے اچھے بلے بازوں کے لئے اسے سمجھنا ممکن نہیں تھا۔ یہ ریورس سوئنگ نہیں تھی، ریورس سوئنگ تو گیند کی ایک طرف سے چمک اتارنے کے بعد ممکن ہو پاتی ہے، عام طور سے تیس چالیس اوورز کے بعد۔ عمران خان نئی گیند سے بھی بہت عمدہ اِن کٹر کراتے تھے۔ ہیڈلی بطور باؤلر شائد عمران سے تھوڑے سے بہتر ہوں، مگر وہ اوسط درجے کے بلے باز تھے۔ عمران خان اور بوتھم زیادہ بہتر بیٹسمین تھے۔ عمران خان کی تکنیک اپنے آخری برسوں میں بوتھم سے بہتر ہو گئی تھی۔ بوتھم اپنے مخصوص مزاج اور بے لگام تبصروں کی وجہ سے پاکستانی کھلاڑیوں کے لئے ناپسندیدہ رہے ہیں۔ فیصل آباد کی ڈیڈ سلو پچ پر بوتھم کو باؤلنگ کرانا پڑتی تو پنجابی محاورے کے مطابق اسے موت پڑ گئی۔ بوتھم نے جلا کٹا تبصرہ کیا کہ پاکستان ایسی جگہ ہے جہاں اپنی ساس کو اس کے تمام اخراجات اٹھا کر دو ہفتے کے لئے بھیجا جائے۔ بوتھم کا اشارہ یہ تھا کہ ساس صاحبہ پاکستان کے دورے سے جانبر نہیں ہو پائیں گی۔ بوتھم کو پاکستانیوں پر ایک غصہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے 1992ء ورلڈ کپ فائنل میں انگلینڈ کو شکست دی۔ بوتھم اس ٹیم کا حصہ تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ ورلڈ کپ جیت لیں گے۔ انگلینڈ کی ٹیم ان دنوں خاصی مضبوط تھی، گراہم گوچ، ایلن لیمب، بوتھم، ایلک سٹیورٹ، گریم ہک، نیل فیئر برادر جیسے بلے باز اس کی ٹیم میں شامل تھے جبکہ باؤلنگ بھی اچھی تھی۔ پاکستان نے ورلڈ کپ فائنل جیت لیا۔ بوتھم کا خیال تھا کہ جن دو گیندوں پر وسیم نے ایلن لیمب اور کرس لیوس کو آؤٹ کیا، وہ بال ٹمپرنگ کے ذریعے ریورس سوئنگ کرائی گئی تھیں۔ بوتھم کے ان خیالات کو ظاہر ہے پاکستانیوں نے پسند نہیں کیا۔ تنازع تب بڑھا جب عمران خان نے اپنی آپ بیتی میں ایک واقعہ لکھا کہ کس طرح ایک کاؤنٹی میچ میں انہوں نے بوتل کے ڈھکنے سے بال کی سیم اکھاڑی اور پھر ریورس سوئنگ کر کے میچ جیتا۔ دراصل عمران خان کے مطابق بال ٹمپرنگ غیر قانونی نہیں اور ہمیشہ سے فاسٹ باؤلرز گیند کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرتے آئے، یہ ان کا حق ہے۔ بوتھم اور لیمب وغیرہ نے اس پر پاکستانی باؤلرز کو دھوکے باز (چیٹر) کہا۔ 1994ء میں عمران خان سے منسوب ایک انٹرویو مشہور بھارتی جریدے انڈیا ٹوڈے میں شائع ہوا۔ اس میں عمران خان نے کہا کہ سابق نامور برطانوی فاسٹ باؤلر فریڈ ٹرومین، بوتھم اور ایلن لیمب وغیرہ دراصل کم پڑھے لکھے، بگڑے ہوئے بیک گراؤنڈ کے کھلاڑی ہیں جو زیادہ تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے نہیں، اس لئے ایسے اوٹ پٹانگ بیانات دیتے ہیں۔ آئن بوتھم کچھ عرصہ کے بعد کرکٹ سے ریٹائر ہو گیا، اس نے ایلن لیمب کے ساتھ مل کر عمران خان پر ہتک عزت کا کیس کر دیا۔ عمران خان نے انڈیا ٹوڈے کے انٹرویو کی تردید کی تھی۔ اس کیس سے

بھی بچنے کی خاصی کوشش کی۔ بوتھم ان دونوں ہواؤں میں اڑ رہا تھا، اسے لگتا تھا کہ برطانوی عدالت سے وہ کیس جیت جائے گا۔

کیس 1996ء جولائی میں چلا، دو ہفتے تک یہ ہائی پروفائل کیس چلتا رہا۔ میڈیا نے اسے بڑی اہمیت دی۔ کئی معروف کرکٹرز نے کیس میں اپنی گواہی دی۔ عمران خان کی جانب سے مشہور برطانوی بلے باز جیف بائیکاٹ بھی پیش ہوئے۔ مجھے آج تک اخبار کی وہ تصویر یاد ہے، جس میں بائیکاٹ ہاتھ میں کھیلنے والے جوگرز پہنے عدالت میں پیش ہوئے۔ انہوں نے غالباً بوٹ کے ذریعے گیند کو ٹمپر کرنے کی مثالیں دیں۔ بوتھم کے ایک کپتان ڈیوڈ گاور اور تب برطانیہ کے کپتان مائیک اتھرٹن نے بھی شہادت دی۔ اتھرٹن نے بھی یہی کہا کہ بال ٹمپرنگ ہوتی رہتی ہے اور آئی سی سی کو اسے قانونی قرار دینا چاہیے۔ یکم اگست 96ء کو عدالت نے کیس کا فیصلہ عمران خان کے حق میں سنایا اور بوتھم، لیمب کو پانچ لاکھ پاؤنڈ (ساڑھے سات لاکھ ڈالر) ہرجانے کا حکم دیا۔ بوتھم، لیمب دونوں پر یہ فیصلہ بجلی بن کر گرا۔ اتنے بڑے ہرجانے نے دونوں کا ایک طرح سے دیوالیہ نکال دیا۔ عمران خان نے اپنی کتاب میں اس کیس کا ذکر کیا ہے اور اس حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ بھی بیان کیا۔ دراصل بوتھم عدالت میں جی بھر کر اپنے مخصوص انداز میں جملے بازی کرتا رہا تھا۔ اس کے فقروں پر کمرہ عدالت قہقہوں سے گونجتا رہا۔ جج کا رویہ بھی واضح طور پر جانبدارانہ تھا۔ عمران خان نے اپنی بائیوگرافی میں لکھا کہ ان کا وکیل بہت مایوس تھا، اس کا کہنا تھا کہ بوتھم برطانوی ہیرو ہے، اس لئے جیوری اس کے حق میں جائے گی۔ گورے وکیل کو گورے جج کی جانبداری پر بھی افسوس تھا۔ امریکہ، برطانیہ اور کئی یورپی ممالک میں جج فیصلہ نہیں دیتا بلکہ اس کے لئے عوام میں سے چند افراد کی جیوری کو منتخب کیا جاتا ہے۔ یہ جیوری عدالتی کارروائی سنتی رہتی ہے اور پھر آپس میں مشاورت کے ذریعے فیصلہ سناتی ہے۔ بارہ رکنی جیوری تھی۔ دس دو (2:10) کے تناسب سے فیصلہ عمران خان کے حق میں آیا۔ عمران نے اپنی کتاب میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ عمران خان لاہور کے ایک صاحب کشف بزرگ میاں بشیر کا بہت عقیدت مند تھا۔ عمران کو روحانیت کی طرف میاں بشیر مرحوم ہی لے آئے۔ کیس کی سماعت کے دوران عمران خان نے میاں بشیر کو دعا کا کہا تو انہوں نے جواب دیا کہ جج اپنا ذہن تمہارے خلاف بنا چکا ہے، فیصلہ خلاف آنے کی توقع ہے۔ جیوری فیصلے سے پہلے مشاورت کے لئے الگ کمرے میں گئی اور اس میں پانچ گھنٹے لگ گئے، اس دوران عمران خان کا میاں بشیر سے رابطہ ہوا۔ حیران کن طور پر میاں صاحب نے واضح الفاظ میں کہا کہ اللہ نے جیوری کا ذہن بدل دیا ہے اور فیصلہ تمہارے حق میں آ رہا ہے۔ عمران خان کو شائد اس بات پر یقین نہ آیا ہو، مگر تھوڑی دیر بعد ایسا ہی ہوا۔ عمران خان مشکل وقت میں ایک ایسا کیس جیت گئے، جو اگر ان کے خلاف ہوتا تو وہ دیوالیہ ہو جاتے۔ بوتھم اس فیصلے پر سخت مایوس ہوا۔ ایلن لیمب نے بعد میں اپنی بائیوگرافی میں لکھا کہ اس فیصلے نے اس کا کباڑا کر دیا۔

❁❁❁

گلدستۂ اردو ادب

ایک دفعہ مولانا ظفر علی خان کے نام مہاشہ کرشن ایڈیٹر "پرتاب" کا دعوت نامہ آیا جس میں لکھا تھا:

فلاں دن پروشنا فلاں سمت بکرمی میرے سُپتر ویریندر کا مُونڈن سنسکار ہوگا۔ شریمان سے نویدن ہے کہ پدھار کر مجھے اور میرے پریوار پر کرپا کریں۔ شُبھ چنتک کرشن۔ (فلاں دن میرے بیٹے ویریندر کی سر مُنڈائی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ تشریف لا کر مجھ اور میرے خاندان پر مہربانی کریں۔)

مولانا نے آواز دی سالک صاحب! ذرا آیئے گا۔ فرمایا کہ مہربانی کر کے اس دعوت نامے کا جواب آپ میری طرف سے لکھ دیجیے۔

برسات کے دن ہیں، بارش تھمنے کا نام نہیں لیتی، میں کہاں جاؤں گا، معذرت کر دیجیے۔ میں نے اُسی وقت قلم اٹھایا اور لکھا:

جمیل المناقب، عمیم الاحسان، معلّی الألقاب، مدیرِ پرتاپ السلام علی من اتّبع الھُدیٰ!

نامۂ عنبر شمامہ شرفِ صدور لایا۔ از بس کہ تقاطرِ امطار بحدّ ہے کہ مانع ایاب ذہاب ہے۔ لہٰذا میری حاضری متعذّر رہے۔ العُذر عند کرام النّاسِ مقبول۔

الرّاجی الی الرّحمۃ والغُفران

ظفر علی خان

مہاشہ کرشن نے یہ خط پڑھنے کی کوشش کی۔ کچھ پلے پڑنا تو درکنار، وہ پڑھنے میں بھی ناکام رہے۔ آخر مولانا کو دفتر "زمیندار" ٹیلی فون کر کے پوچھا:

مولانا! آپ کا خط تو مل گیا لیکن یہ فرمایئے کہ آپ آسکیں گے یا نہیں؟

اس پر مولانا ظفر علی خان نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور مہاشہ جی سے کہا کہ:

آپ کا خط میں نے ایک پنڈت جی سے پڑھوایا تھا۔ آپ بھی کسی مولوی صاحب کو بلوا کر میرا خط پڑھوا لیجیے۔

❁❁❁

اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

وہ نئی چال ہی نہ چل جائے　　یوں نہ ہو کھیل ہی بدل جائے
کتنا نازک ہے وہ پری پیکر　　جس کا جگنو سے ہاتھ جل جائے

مطلع تو آپ پر کھل چکا ہوگا کہ بادل چھٹے ہیں تو گم آسمان نظر آنے لگا ہے۔ ہر چیز عیاں ہونے لگی ہے اور آسمان پر رات کو ستارے بھی خوب چمکیں گے اور جن سے ہاتھ ہوا ہے وہ ستارے گنیں گے یہ منظر اہل بصیرت پر تو پہلے ہویدا تھا۔ یعنی اس کی کھلی نشانیاں تو جناب زرداری کی آئیں بائیں شائیں سے ظاہر ہو رہی تھیں۔ پی ڈی ایم کو بگلہ قابو کرنے کا طریقہ سکھایا جا رہا تھا یہ طریقہ نئے لوگوں کو معلوم نہ ہو تو ان کا تجسس دور کرنے کے لئے بتائے دیتے ہیں کہ آپ بگلہ پکڑنے میں جلدی ہرگز نہ کریں کہ جلدی کے کام شیطان کے ہیں۔ پہلے تو آپ اسے پکڑنے کی دل میں ٹھان لیں۔ بگلے کو کسی اچھی جگہ پر بیٹھنے دیں۔ پھر آپ بچ بچا کر دبے پاؤں اس کی طرف خرام کریں بہت احتیاط کہ قدموں کی آہٹ نہ ہو۔ یہ تو میں بھول گیا کہ آپ نے موم ساتھ لے کر جانی ہے۔ اگر نہ ملے تو موم بتی بھی چل جائے گی۔ موم بتی جلانی نہیں ہے۔ بس موم کسی طریقے سے بگلے کے سر پر رکھ آنی ہے ہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ گرم دن میں یہ کارروائی ڈالنی ہے۔ چمکدار سورج ہی سے اس کے سر پر رکھی موم پگھلے گی اور اس طرح پگلتی ہوئی موم اسے اندھا کر دے گی۔ اسے نظر آنا بند ہو جائے گا تو آپ نے بھاگ کر اس کو پکڑ لینا ہے۔ یقینا آپ میری تحریر پڑھ کر ہنس رہے ہونگے اب جس کو اللہ نے ذھن دیا ہے وہ ذھن لڑائے اپنا کام تھا آپ کو بات سمجھانا: بات ایسی ہے بتانے کی نہیں دنیا کو رو پڑے ہم بھی خریدار تک آتے آتے بہر حال ن لیگ کی حالت پر امیر مینائی کا ایک شاندار شعر صادق آتا ہے۔ اگر نواز شریف کو شعری ذوق ہوتا تو وہ یہ شعر بار بار عطاء الحق قاسمی کو سناتے یا پھر عرفان صدیقی کو: ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے اسی غزل کا ایک اور شعر بھی لاجواب ''وصل کا دن اور اتنا مختصر، دن گنے جاتے تھے جس دن کے لئے'' مگر یہاں تو حاصل بھی عجیب تھا کہ آنا ہی جانے کی تمہید تھی ہائے۔ بے قدراں نال لائی تے ٹٹ گئی تڑک کر کے۔ متذکرہ غزل کا ایک اور شعر دل میں گدگدا رہا ہے۔ ظالم نے بھرم ہی نہیں رہنے دیا: تھوڑی سی وضعداری تو اس دل کے واسطے اس نے تو اس میں وہم بھی پلنے نہیں دیا ویسے مزے کی بات ہے کہ جو کچھ بھی ہوا ہے یہ کوئی انہونی نہیں ہے۔ یہ حادثہ تو نہیں ہے۔ رانا ثناء اللہ فرما رہے ہیں کہ ابھی زرداری صاحب تقریر کر رہے تھے کہ سب کچھ سوشل میڈیا پر آ گیا تھا۔ بات ان کی درست ہے کہ کسی نے سب کچھ لیک کر دیا مجھے تو اس بیان پر بھی تعجب ہے کہ: راز کی کچھ حقیقت نہیں ہے فقط اک تمنا کہ بس وہ جو خود ہم بتانا نہیں چاہتے راز داں کھول دے دونوں پارٹیاں ہی اپنی اپنی مار پر تھیں کہ مولانا کو کس نے اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا ہے۔ یہ تو درست ہے کہ پیپلز پارٹی ن لیگ مولانا اور دوسروں کو بیچ منجھدار چھوڑ گئی۔ ویسے بظاہر وہ اس کا اعلان نہیں کر رہے اور مزے لے رہے ہیں۔ ویسے تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والے زرداری پتھر ساتھ لے کر دبئی میں کافی عرصہ یقین دہانیاں کرواتے رہے۔ بلے کے دودھ پینے والا قصہ بھی انہی کے ساتھ منسوب ہے۔ ویسے بلوچ ہوتے تو بہادر ہیں اور وہ تو مرد حر بھی ہیں۔ واقعتاً کہ لوگ ہی تو تاریخ بناتے ہیں یہ سب لوگ پاکستان کے خیر خواہ ہیں مگر ہم تو عوام کا سوچتے ہیں کہ تیرا کیا بنے گا کالیے؟

عمران خاں کا بار بار بیان پڑھتے ہیں کہ انہیں مہنگائی کو کم کرنا ہے یا مہنگائی سے نمٹنا ہے آپ عوام کو مہنگائی سے نجات دلانے جا رہے ہیں۔ اڑھائی سال سے یہی اظہار۔ عوام بے چارے تو مرے ہوئے ہیں۔ کوئی غیبی مدد ہی آئے تو آئے ۔ آئے بکنے پہ تو حیرت میں ہمیں ڈال دیا وہ جو بے مول تھے نیلام سے پہلے بار بار یہی کہا جا رہا ہے کہ پی ڈی ایم اصل میں غیر فطری اتحاد تھا اس کا یہی حشر ہونا تھا تو کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ حکومتی جماعتوں کا اتحاد عین فطری ہے۔ کیا پی ٹی آئی' متحدہ اور ق لیگ کی ایک ہی فطرت ہے۔ ویسے ان سب کی فطرت ایک ہی ہے یہ کسی وقت بھی کسی سے مل سکتے ہیں۔ جب توقع ہی اٹھ گئی غالب کیا کسی سے گلہ کرے کوئی۔ عمران خان کو یار آخری امید کہتے تھے۔ کبھی کبھی سارے تماشے سے گھن آنے لگتی ہے۔ کس کو بھولا ہوگا کہ زرداری صاحب والا کام نواز شریف بھی 2007ء میں کر چکے اور مولانا 17 ویں ترمیم پر دستخط کر کے قاضی صاحب کے ساتھ بے وفائی کر چکے اور پھر سادگی دیکھیں کہ وہ عوام سے کیوں معافی مانگیں یعنی وہ جنرل کے وعدے کو نہیں جانتے تھے۔ ہم تو جنرل ضیاء الحق کے وعدے کو بھی جانتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح سے الیکشن کروائے تھے وعدہ 90 دن کا تھا۔ پتہ نہیں لکھتے لکھتے میں کدھر کا کدھر نکل گیا میڈیا عوامی مسائل اجاگر کرے۔ عوام کو تو کوئی مسئلہ ہی نہیں وہ تو خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں:

پوچھتے ہیں کہ کیا ہوا دل کو حسن والوں کی سادگی نہ گئی

ایسے ایک مصرع ذھن میں آیا تو پہلا مصرع بنا لیا۔ پتہ نہیں اصل شعر کیا ہے؟

در در دھکے کھا تو رہا ہوں پل پل آنسو پی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

عورت مارچ: حقوق کا مطالبہ کس سے اور کیوں؟

تحریر: ابن قدسی

گائے کا نام آتے ہی ذہن میں ایک شریف، بلا مانس اور ہر لحاظ سے فائدہ مند جانور کا تصور ابھرتا ہے ۔ اس کے دودھ اور گوشت کے فوائد کی ایک لمبی فہرست ہے اور ان کو بیان کرنے کے لیے کئی صفحات درکار ہونگے ۔شاید اس کی انہیں خوبیوں کی بناء پر کسی معاشرے میں اسے انتہائی اہم قرار دیتے ہوئے اسے متبرک وجود کے طور پر اپنایا گیا اور اس کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے اسے تکلیف پہنچانے والے کو سخت گناہ گار سمجھا گیا۔ یہ سڑکوں پر آزاد پھرے لیکن کوئی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔لیکن اس فائدہ مند وجود کے سڑکوں پر آزاد پھرنے سے معاشرے کو ابتلاء پیش آیا۔ ہندوستان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہاں اسی شریف اور بھلے مانس گائے کو دیوی دیوتا کا درجہ دے کر اسی کے نام پر انسانوں کا خون بہایا جاتا ہے۔اس کے پیشاب کو دنیا کی متبرک چیز اور انسانی خون کو ناپاک قرار دے دیا۔ وہ انسانی خون کسی مسلمان کا ہی ہوتا ہے۔

غلط عقیدہ اور غلط سوچ کا کم عقلی اور بے وقوفی سے گٹھ جوڑ ہو جائے تو معاشرہ کو اس کے بڑے بھانک نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔غلط عقیدہ بہت خطرناک ہوتا ہے اسی لحاظ سے غلط سوچ بھی کم نہیں ہے۔ایک جانور جسے خدمت انسانیت کے لیے پیدا کیا گیا اور اس کی تخلیق اس طرح کی گئی کہ مخلوقات میں اسے ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہو لیکن اسے قتل انسانیت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے یہ صرف غلط عقیدہ اور غلط سوچ کا ہی نتیجہ نہیں بلکہ اس کے ساتھ کم عقلی اور بے وقوفی کا بھی پورا حصہ ہے۔تخلیق کو اس کی اصل سے ہٹانے کا نتیجہ ہے۔انسان خود جب کوئی چیز بناتا ہے تو اس تخلیق کی کوئی وجہ ہوتی ہے، کسی غرض کے لیے کوئی چیز بنائی جاتی ہے۔ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ایک چھری کاٹنے کے لیے بنائی جاتی ہے اور اس کی غیر معمولی اہمیت ہے اگر اس کو ہم اپنی زندگیوں سے نکال دیں تو شاید ہمارے کھانے کی صورت اور ہیئت ہی بدل جائے اور انسانی رہن سہن پر اس کے غیر معمولی اثرات مرتب ہونگے۔اب اگر کوئی یہ مظاہرے شروع کردے کہ چھری سے ہاتھ اور گلا کٹ سکتا ہے اس لیے آئندہ سے چھری سے کوئی کام نہیں لیا جائے گا بلکہ بنانے والے کو سزا دی جائے۔ پلے کارڈ اٹھا کر اس پر یہ لکھا کر مظاہرہ کیا جائے" ہماری چھری ہماری مرضی" اب چھری کوئی کام نہیں کرے گی۔اسے ہر وقت کچن میں مصروف رکھا جاتا ہے۔گھر کے کام لیے جاتے ہیں۔اس کے کوئی حقوق نہیں۔اس لیے آئندہ چھری سے کاٹنے پر پابندی ہے۔اب اس طرح کے مظاہرہ اور باتوں کو پاگل پن کا ہی نام دیا جاسکتا ہے۔ایک غلط سوچ کے ساتھ کم علمی اور کم عقلی کی

یہی صورت بنے گی۔اس کے ساتھ ہی ایک دوسری سوچ بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ نعرہ یہی ہوگا" ہماری چھری ہماری مرضی" نتیجہ یہ ہوگا کہ چھری ہماری ہے ہم نے بنائی ہے۔کاٹنا اس کی خوبی ہے۔اب اس سے جو مرضی کاٹا جائے اس پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔کاٹتے ہوئے یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کیا کاٹا جارہا ہے۔وہ کوئی سبزی ہے یا پھل، یا کسی کا گلا۔چھری بنی ہی کاٹنے کے لیے اس لیے ہم اپنی مرضی سے جو مرضی کاٹیں۔ایسی غلط سوچ رکھنے والے کم علم اور کم عقل انسان کو بھی پاگل قرار دے کر پکڑا جائے گا۔

ایک انسانی تخلیق کسی مثبت سوچ کے تحت ہوتی ہے اور اسی مثبت سوچ کو مدنظر رکھ کر کیا گیا استعمال ہی مثبت نتائج نکالتا ہے ورنہ اس کے نتائج مثبت نہیں ہوتے۔دیا سلائی سے آگ لگائی جاتی ہے۔کھانا پکانے کے لیے آگ لگائی جائے تو ٹھیک ورنہ کسی کے گھر کو بھی آگ لگائی جاسکتی ہے۔کسی بچے کے ہاتھ میں دیا سلائی چلی جائے تو ممکن ہے اپنی کم عقلی سے کوئی بڑا نقصان کرلے۔لیکن کسی بچے کے غلط استعمال سے دیا سلائی یا آگ کی افادیت پر سوالات نہیں اٹھائے جائیں گے یا اس سے جلانے کا کام نہیں لیا جائے گا یہ نعرہ نہیں لگایا جائے گا" ہماری دیا سلائی ہماری مرضی" اور پھر یہ کہا جائے کہ دیا سلائی سے آئندہ جلانے کا کام نہیں لیا جائے گا۔بے چاری اچھی بھلی پیاری سی دیا سلائی جلنے کے بعد کالی ہوجاتی ہے۔اس پر یہ ظلم نہیں ہونے دیا جائے گا۔آئندہ آگ جلانی ہے تو کسی اور طریق سے ہو جلاؤ لیکن دیا سلائی سے جلانے کا کام نہیں لیا جائے گا۔دیکھا جائے تو دیا سلائی بنائی ہی آگ جلانے کے لیے اگر اس سے آگ جلانے کا کام نہیں لینا تو پھر اس کا کیا کرنا ہے۔انسان اپنی تخلیقات کے

حوالے سے بہت محتاط ہوتا ہے۔اس کے استعمال کو تفصیلی ہدایات کے ذریعہ بتاتا ہے۔اس کے اچھے اور مثبت استعمال پر زور دیتا ہے اور اس کے درست استعمال کے بھرپور فوائد سے آگاہ کرتا ہے۔ جب انسان اپنی تخلیقات میں اس اصول پر کارفرما ہے اور اسی اصول کو عقل وفہم کی علامت قرار دیتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی تخلیقات میں منفی اور غیر حقیقی اصولوں کو اپنانا ناانصافی ہوگی۔ انسانی تخلیقات میں انسانوں کے وضع کردہ اصولوں کو اپنانا ہی اصلی حقیقت ہے تو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اصولوں کو اپنانا عین انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔انسانی تخلیق کے حوالے سے بیان کردہ اصولوں سے روگردانی تخلیق سے ناانصافی تو پھر اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق کے حوالے سے بیان کردہ اصولوں سے انحراف بھی ناانصافی ہی ہوگی۔ انسانی معاشرے میں اس شخص کی عقل پر سوالیہ نشان لگایا جاتا ہے جو کسی تخلیق کے حوالے سے بنائے اصولوں کے برخلاف اپنی مرضی کے اصول اس پر لگائے گا۔ایک گاڑی کو بھی اس کے اصولوں کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے کوئی نہیں جو اس میں پٹرول کی جگہ پانی ڈال کر شور مچائے کہ (میری گاڑی میری مرضی) اور پھر کہے کہ اب گاڑی اسی طرح چلے جیسے پہلے چلتی تھی تو لوگ اس کی عقل پر ماتم ہی کریں گے۔ یا ایک سڑک جس پر ٹریفک آرہی اور وہ اس پر جانا شروع کردے اور گاڑی پر بڑا سا بورڈ لگا دے کہ "میری گاڑی میری مرضی" تو اس کے خلاف قانون حرکت میں آئے گا۔گاڑی سے گاڑی کا کام لو اور ریل گاڑی سے ریل گاڑی کا اور ہوائی جہاز سے ہوائی جہاز کا۔ وہاں قطعاً انسان کی اپنی مرضی نہیں چلتی بلکہ جو اپنی مرضی چلائے گا وہ نقصان میں جو بنانے والے کی مرضی کے مطابق چیز استعمال کرے گا وہی فائدہ میں رہے گا۔ایک حدیث ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ: صَلَّى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الصُّبْحِ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ، فَقَالَ: بَيْنَا رَجُلٌ يَسُوقُ بَقَرَةً إِذْ رَكِبَهَا فَضَرَبَهَا، فَقَالَتْ: إِنَّا لَمْ نُخْلَقْ لِهَذَا إِنَّمَا خُلِقْنَا لِلْحَرْثِ، (صحیح بخاری، حدیث نمبر 3471، کتاب: کتاب انبیاء علیہم السلام کے بیان میں باب: باب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھی پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "ایک شخص (بنی اسرائیل کا) اپنی گائے ہانکے لیے جارہا تھا کہ وہ اس پر سوار ہو گیا اور پھر اسے مارا۔اس گائے نے (بقدرت الٰہی) کہا کہ ہم جانور سواری کے لیے نہیں پیدا کئے گئے۔ ہماری پیدائش تو کھیتی کے لیے ہوئی ہے۔"

انہیں الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ایک اور جگہ بھی ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، صَلَّى بِنَا رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم صَلَاةً، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: ((بَيْنَا رَجُلٌ يَسُوقُ بَقَرَةً إِذْ رَكِبَهَا فَضَرَبَهَا، قَالَتْ: إِنَّا لَمْ نُخْلَقْ لِهَذَا إِنَّمَا خُلِقْنَا لِلْحِرَاثَةِ۔

(مسند احمد، حدیث نمبر 11573، کتاب: خلافت وامارت کے مسائل باب: ان خصوصیات وفضائل کا بیان جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ میں مشترک ہیں)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ایک دفعہ ایک آدمی گائے کو ہانکے جارہا تھا کہ وہ اس پر سوار ہو گیا اور اس نے اسے مارا، آگے سے گائے نے بول کر کہا کہ ہمیں سواری کے لیے تو پیدا نہیں کیا گیا، ہمیں تو کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کتنا زبردست پیغام موجود ہے۔گائے کی بظاہر شکل ویسی ہے جیسے سواری والے جانور کی ہے۔ چار ٹانگیں اسی طرح بیٹھنے کی جگہ لیکن پیغام یہ دیا گیا کہ جو مخلوق جس کام کے لیے بنائی گئی اس سے وہی کام لیا جائے تو فائدہ ہوگا ورنہ نقصان ہی ہوگا۔گائے دودھ اور گوشت کے لیے ہے اگر اس پر سواری کرنی شروع کردی جائے تو دیگر فوائد سے محروم ہو جاؤ گے۔سواری کے لیے اور جانور مل جاتے ہیں جو گائے سے بہتر سواری کے طور پر استعمال ہو سکتے ہیں لیکن ان جانوروں سے وہ فوائد نہیں جو گائے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے جس کام کے لیے جو چیز بنی ہے اس سے وہی فائدہ اٹھانا چاہیے۔وہاں اپنی مرضی نہیں چلانی چاہیے۔اگر کسی نے قصوروار ٹھہرانا ہے تو ٹھہرا دے لیکن عورت مارچ میں شریک بے ہودہ ڈانس کرتی، پلے کارڈ پر بے معنی، بے مقصد اور قابل شرم نعرے لکھوا کر سڑکوں پر خجل خوار ہونے والے عورت نما ٹولے کو دیکھ کر اوپر لکھا گیا مضمون ذہن میں آجاتا ہے۔

عورت کا رشتہ ماں کی صورت ذہن میں آئے تو ایک متبرک ہستی کے طور پر آتا ہے۔جس کی بے انتہا شفقتوں اور مہربانیوں کے بعد ایک مرد اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا ہے۔جس کی آغوش جنت کی ٹھنڈی ہوا محسوس ہوتی ہے۔جس کی خدمت سے دنیا وآخرت کی حسنات نصیبا بنتی ہیں۔ ماں کے سجدے میں گرے آنسو بیٹے کو شیر بنا دیتے ہے اور وہ پہاڑ سے ٹکرانے کی ہمت پیدا کر لیتا ہے۔ماں تربیت کرے اور بیٹے کو عورت کے حقوق ادا کرنے سکھائے تو وہ مرد فرض سمجھ کر عورت کے حقوق ادا کرتا ہے۔ماں کی خدمت تو ویسے ہی عبادت سمجھ کر کی جاتی ہے۔پھر سمجھ نہیں آتا کہ اس عورت (ماں) کو بیٹے سے کیا حقوق چاہئیں اور کس قسم کی آزادی درکار ہوئی کہ اسے سڑکوں پر نکل کر نعرے لگانے پڑے۔جب مرد (بچہ) ماں کی گود میں تھا اور اسے مکمل اختیار تھا جیسے مرضی اس کی تربیت کرے۔اس وقت اس کی تربیت کرتی تو بعد میں گھر بیٹھ کر اس سے خدمت کروا سکتی تھی اور مرد (بیٹا) ماں کی خدمت جنت کمانے کے لیے کرتا۔عورت (بہن) تو بھائی کا مان اور عزت ہوتی ہے۔ بھائی سے

اٹکیلیاں اور شرارتیں تو چلتی ہیں ماں سے کم ہی سہی لیکن بہن کا بھائی کے لیے پیار بھی کسی پیمانہ سے ناپا نہیں جا سکتا۔ ایک ہی ماں کے پیٹ سے جنم لینے کی وجہ سے محبت اور پیار کا ایک بے مثال رشتہ ہوتا ہے۔ اس عورت (بہن) کو بھائی سے کیا حقوق چاہئیں اور کس قسم کی آزادی درکار ہے کہ اسے سڑکوں پر نکل کر لوگوں کے سامنے ڈانس کرنا پڑے۔ عورت (بیوی) پر معاشرے کی بقا اور دوام کا انحصار ہوتا ہے۔ سوسائٹی میں امن وسکون اور راحت اسی عورت (بیوی) کی وجہ سے ہوتا ہے۔ وہ مرد (خاوند) کے شانہ بشانہ کھڑی ہوتی اور حالات کا مقابلہ کرتی ہے۔ وہ اپنے مرد کو اپنی محبت اور پیار سے گرویدہ کر کے معاشرہ میں اس مرد کے مثبت کردار پر بے شمار اثرات مرتب کرتی ہے۔ تھوڑی سی قربانی، صبر اور ہمت دکھائے تو جو نتائج نکلیں گے وہ اس قربانی، صبر اور ہمت سے کہیں بڑھ کر ہونگے جو عورت نے دکھائی ہوتی ہے۔ مرد اپنی صحت، اپنے آرام، اپنے سکون کی قربانیاں دے کر بھی سمجھتا ہے کہ بیوی کی قربانی اور صبر کا حق ادا نہیں ہوا۔ ناز ونخرے بھی اٹھاتا ہے۔ وہ اپنا سکون اور اپنی راحت اپنے گھر میں پا کر دن بھر کی تھکان سے بے پروا ہو جاتا ہے اور پھر اگلے دن کمر ہمت کس کر اپنے جنت نما گھر کو خوشحال بنانے کے لیے زمانے اور حالات کا مقابلہ کرنے نکل جاتا ہے۔ یہاں عورت (بیوی) کو کچھ قربانی کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ عورت کا یہ رشتہ خونی نہیں ہوتا۔ خونی رشتہ میں قدرتی لگاؤ موجود ہوتا ہے وہ ٹوٹتے ٹوٹتے ٹوٹتا ہے لیکن اس رشتہ میں مضبوطی قائم کرنی اور رکھنی پڑتی ہے۔ عورت کی طبیعت میں موجود پیار، نرمی، محبت، ایثار، قربانی، صبر، لگاؤ جیسی عظیم الشان خوبیاں اس رشتہ کو مضبوط کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ مرد کی ایک بہت بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کے اندر یہ عظیم الشان خوبیاں عورت کی نسبت کم ہوتی ہیں۔ زمانے کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کا دل سخت ہوتا ہے جس وجہ سے یہ خوبیاں مرد کے دل میں پہنچ کر اپنی مقدار کم کر لیتی ہیں لیکن عورت کے دل میں ان خوبیاں کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے ان خوبیوں کی وجہ سے وہ اپنے گھر کو جنت بنا سکتی ہے۔ اس کے لیے اسے سڑکوں پر بینر اٹھا کر بے ڈھنگا ناچ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ ان خوبیوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنے گھر کی ملکہ بن سکتی ہے اور اپنے مرد کے دل کی بھی۔ ایک دفعہ مرد کے دل کی ملکہ بن گئی تو وہ عورت کے لیے زمانے سے لڑ جاتا ہے۔ اپنا خون خواہ محنت مزدوری کی شکل میں بہائے یا واقعی اسے اپنی عورت کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ دینا پڑے تو وہ دے دیتا ہے۔ محبت، پیار، الفت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ لیکن یہ طاقت سڑکوں پر کھوکھلے نعرہ لگانے اور دوسروں کو دکھانے سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ دل کا معاملہ ہے اسے دل تک رکھنا چاہیے۔

عورت (بیٹی) تو ہوتی ہی آنگن کا پھول، باپ کے دل کی پری۔ اس حوالے سے عورت (بیٹی) کو حقوق لینے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی بس تھوڑا سا نخرا دکھائے تو باپ کا دل پگل جاتا ہے۔ اس کے لیے گھر سے باہر قدم رکھنے کی ضرورت نہیں۔ بیٹی باپ سے حقوق مانگنے کے لیے کسی اور کے پاس جائے تو یہ بات ویسے ہی باپ کو بری لگتی ہے۔ اور یہ باپ جیسے عظیم رشتے کی توہین بھی ہے۔ اب آتے ہیں دوسرے رخ کی طرف۔ مرد (بچہ) کو ماں کی آغوش جنت نما ٹھکانہ لگتا ہے۔ ہوش سنبھالنے پر اسے رشتوں کا احساس ہوتا ہے۔ اسے جب یہ لگے کہ اس کی ماں اسے اس کی بہن پر ترجیح دیتی ہے تو لاشعور میں اسے عورت (بہن) ایک کمتر رشتہ کے طور پر محفوظ ہو جاتی ہے۔ پھر تھوڑا بڑا ہوا تو وہ اپنی ماں کی آنکھوں سے اپنے باپ کی ماں یعنی ساس اور بہنوں یعنی پھوپھیوں کی برائیاں نظر آتی ہیں تو اس ذہن میں عورت کے لیے احترام اور احساس لاشعوری طور پر کم ہو جاتا ہے۔ پھر اپنی مظلومیت کے لیے روتے دھوتے دیکھ کر اس کی ماں اپنی عزت وتوقیر داؤ پر لگا دیتی ہے۔ ماں کو باپ کے ساتھ بدکلامی کرتا دیکھ کر اس کے اندر یہ "فن" بھی بیدار ہو جاتا ہے کہ کس طرح رشتہ کی پاسداری ختم کرنی ہے۔ اس کی ماں اسے یہ نہیں بتاتی کہ حقوق کی ادائیگی کس طرح کرنی ہے۔ عورت خواہ وہ ماں، بہن، بیوی، بیٹی کے روپ میں ہو کس طرح اس کے حقوق کا خیال رکھنا ہے۔ پھر وہی مرد سڑکوں پر عورت کو یہ نعرہ لگاتے دیکھے کہ ان کے حقوق ادا کیے جائیں تو اسے احساس ہوتا ہے کہ میری ماں نے مجھے یہ سب کچھ نہیں سکھایا جب میری سیکھنے کی عمر تھی۔ اب یہ عورتیں کون ہیں جو عورت کے حقوق کی بات کر رہی ہیں۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عورت نما مخلوق کو عقل اور سمجھ دے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو خوبیاں دی ہیں اگر وہ ان کا درست اور بروقت استعمال کریں تو معاشرے میں موجود ایک ایک بچہ مرد بن کر عورت کے ہر رشتہ کے حقوق ادا کرے۔ اگر عورت اپنی عظیم الشان خوبیاں کی بدولت بچے کے شعور، لاشعور اور تحت الشعور میں عورت کے حقوق کی ادائیگی محفوظ کر دے تو اسے یوں بے توقیر نہ ہونے پڑے۔ ان عظیم الشان خوبیوں کی بدولت عورت بلند وبالا مقام پر کھڑی ہوتی ہے اسے زمین بوس ہونے کی ضرورت نہ پڑے۔ عورت اگر اپنے مقام اور حیثیت کو سمجھ لے تو اسے خود اپنے وجود پر فخر ہو۔ اصل بات اپنے مقام اور حیثیت کو سمجھنے کی ہے۔ جس عظیم مقصد کے لیے عورت کی تخلیق ہوئی ہے وہ مقصد انسانیت کی بقاء ہے۔ انسانیت کے دوام کا انحصار عورت پر ہے اس لیے اس کے بے شمار حقوق خود خالق نے مقرر اور بیان کر دیے ہیں پھر کن حقوق کی تلاش میں یہ عورت یوں سڑکوں پر بے توقیر ہو رہی ہے۔

شعبہ پاکستان

تالپور حکمرانوں کا تعمیراتی شاہکار ''فیض محل''

تحریر: چوہدری محمد ارشاد

ضلع خیر پور سندھ کا قدیم شہر ہے جو سکھر سے 25 کلومیٹر جنوب میں جب کہ کراچی سے 345 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ قیام پاکستان سے قبل یہ آزاد ریاست تھی جسے 1955ء میں پاکستان میں ضم کر دیا گیا۔ اس کی تاریخ انتہائی قدیم ہے۔ 1786ء میں میر سہراب خان تالپور نے اس شہر کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ میر سہراب خان کے بعد میر رستم تالپور، میر علی مراد تالپور، میر فیض محمد تالپور اور میر امام بخش تالپور خیر پور ریاست کے حکمراں رہے۔ جہاں انہوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی تگ و دو کی، وہیں نئے قلعے اور عمارتیں بھی تعمیر کروائیں۔ تالپور حکمراں فن تعمیر سے گہری دل چسپی رکھتے تھے اور ان کی عمل داری میں بہترین معمار اور فن نقاشی کے ماہرین رہائش پذیر تھے۔ ان کے دور حکومت میں ''قبو'' یعنی خوب صورت مقابر تعمیر کرائے گئے، جن میں میران تالپور کے مقبرے شامل ہیں۔ میر سہراب خان تالپور نے کوٹ ڈیجی کا قلعہ تعمیر کروایا۔ ان کا ایسا ہی تعمیراتی شاہکار ''فیض محل'' ہے۔ خیر پور شہر کے شمال مغرب میں واقع فیض محل سابقہ خیر پور ریاست کے تالپور حکمرانوں کی وہ عظیم یادگار ہے، جس کی مثال پورے برصغیر پاک و ہند میں کم ہی ملے گی۔ اس خوب صورت محل کی تاریخ دو سو سال پرانی ہے، اس کی تعمیر خیر پور کے شاہی خاندان تالپور میرس نے 1798ء میں کروائی۔ یہ آرام گڑھ اور ''لکھی محل'' کے نام سے بھی معروف ہے۔ اسے مغلیہ طرز تعمیر اور آرٹ ورک کا بہترین شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

میر فیض محمد خان تالپور ریاست خیر پور کے چوتھے حکمراں تھے، جو ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں فنون لطیفہ سے بے انتہا لگاؤ تھا جس کا لازوال عکس فیض محل میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ پرشکوہ عمارت اپنے حسن اور طرز تعمیر کے باعث میران خیر پور کے تاریخی ورثے کا ایک نادر نمونہ ہے۔ میر فیض محمد خان تالپور 1894ء سے 1909ء تک ریاست خیر پور کے حکمران رہے۔ ان کے اس تعمیری شاہ کار کو ان کے نام کی مناسبت سے فیض محل کا نام دیا گیا۔ کیوں کہ اس دور میں اس عظیم الشان عمارت کی تعمیر پر ایک لاکھ روپے لاگت آئی تھی اس لیے اسے ''لکھی محل'' بھی کہا جاتا ہے۔ فیض محل دو منزلہ عمارت ہے، جو لال اینٹوں سے تعمیر کی گئی ہے، جب کہ اس کا اگلا حصہ ہندوستان کے شہر جے پور سے منگوائے گئے زرد پتھروں سے سجایا گیا ہے، ان پتھروں کی سجاوٹ اور چمک دمک میں اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی کوئی فرق یا تبدیلی نہیں آئی۔ محل کا مرکزی ہال سرکاری تقاریب اور دربار کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، روشن دانوں سے سجائے گئے اس خوب صورت ہال میں اس دور کا فرنیچر، جھولے اور نایاب اشیاء آج بھی موجود ہیں۔ دروازے، کھڑکیوں سمیت جتنی بھی چیزیں اس میں ہیں وہ سب دیار، ساگوان، پرتل اور چلغوزے کی لکڑی سے بنی ہوئی ہیں، اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ اشیاء آج بھی نئی لگتی ہیں۔ فیض محل میں ڈائننگ ہال بھی بنا ہوا ہے۔ ہال کے دونوں اطراف اخروٹ کی لکڑی سے بنوائی گئی، ڈائننگ ٹیبل بناوٹ کے لحاظ سے بے حد عمدہ اور بے مثال ہے۔ اس شان دار محل کے آگے مغلیہ طرز کا ایک باغ بھی بنایا گیا ہے، جو تقریباً بیس ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے، کشادہ باغ میں اماتاس، شیشم، کھجور کے درخت فضاء کو اور بھی خوش گوار بناتے ہیں۔ محل کی دائیں اور بائیں جانب توپیں نظر آتی ہیں۔ مرکزی ہال کی دیواروں پر تالپور حکمرانوں سے لے کر ان تمام ملکی شخصیات کی تصاویر آویزاں ہیں، جنہوں نے فیض محل کے دورے کیے۔ ان میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان بھی شامل ہیں۔

اگرچہ حکومت اور محکمہ قدیم آثار و محکمہ ثقافت کی عدم توجہی کے باعث ہمارا تاریخی ورثہ زبوں حالی کا شکار ہے، مگر کچھ عمارتیں وقت کے ستم کے باوجود اپنا وقار اور شناخت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ آج بھی فیض محل میں ہر ایک شے کو اپنی اصل حالت میں برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، تاکہ اس تاریخی ورثے کو دیکھ کر گزرے زمانے کی یاد تازہ کی جاسکے۔ اسے دیکھنے والے اس دور کو یاد کرتے ہیں جب یہ عمارت ایک ریاست کی شان و شوکت کی علامت تھی۔ اس میں عجیب سا سحر ہے، جو خیر پور کی سیر کے لیے آنے والے افراد کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس محل کی بناوٹ اور فن تعمیر کی مہارت کو دیکھ کر کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اس کے مختلف حصوں میں گھومنے کے دوران اس خوب صورت محل کی کشش آنے والوں کو جکڑ لیتی ہے۔ مغلیہ فن تعمیر کا نمونہ، یہ عمارت خیر پور ریاست کی سب سے نمایاں عمارت رہی ہے۔ خیر پور ریاست کے دفاع کے لیے فوج بھی تھی مگر ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے بعد اس ریاست کو 1955ء میں پاکستان میں شامل کیا گیا جس کے بعد خیر پور ریاست کا وجود ختم ہوا اور اس نے ایک شہر کی حیثیت حاصل کر لی۔ آج بھی فیض محل میں ہر ایک شے کو اپنی اصل حالت میں برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے تاکہ اس تاریخی ورثے کو دیکھ کر گزرے زمانے کی یاد تازہ کی جاسکے۔

چائے، پکوڑے اور انصاف

تحریر: محمد حنیف

آپ بھی کبھی عرضی لے کر گئے ہوں گے۔ کبھی بجلی کا ناجائز بل کم کروانے، کبھی بیٹے کو تھانے سے چھڑوانے، کبھی بیٹی کو یونیورسٹی میں داخلہ دلوانے۔ اگر آپ باقاعدہ کارڈ والے صحافی ہیں، حاضر سروس یا ریٹائرڈ فوجی افسر ہیں، یا کسی بھی نیم اہم سرکاری عہدے پر فائز ہیں یا پھر آپ کو خود بھی نہیں پتہ کہ آپ کیا ہیں، لیکن آپ کے کسی بااثر دوست یا رشتے دار نے افسر سے پہلے سے بات کر رکھی ہے تو آپ کو دفتر میں کرسی پیش کی جائے گی، پھر آپ کے عہدے یا آپ کی سفارش کرنے والے کے عہدے کے حساب سے چائے پیش کی جائے گی۔ ہوسکتا ہے آپ دل میں کہیں کہ 'بھائی چائے تو گھر پر بھی مل جاتی ہے، آپ میری عرضی پر تو کارروائی کریں۔' لیکن آپ ایسا نہیں کریں گے، کیوں کہ ہوسکتا ہے چائے سے انکار پر افسر آپ کو بدتمیز سمجھ کر بدگمان ہو جائے۔

اگر آپ میری طرح سرکاری درباری ماحول سے ذرا زیادہ ہی مرعوب ہوتے ہیں تو ہوسکتا ہے اپنی عرضی بھول جائیں اور باہر آ کر کہتے پھریں کہ 'کام ہو نہ ہو، آپ کے بھائی کی عزت بہت ہے۔' زندگی میں ایک دفعہ ایک وزیرِ اعظم نے چائے پلائی تھی (آزاد کشمیر کا وزیرِ اعظم، وزیرِ اعظم ہی ہوتا ہے)۔ چائے کے ساتھ انتہائی لذیذ پکوڑے بھی تھے۔ تب سے مجھے یہی لگتا ہے کہ وزیرِ اعظم اپنے پائین باغ میں بیٹھا چائے پیتا ہوگا اور پکوڑے کھاتا ہوگا۔ اگر میں وزیرِ اعظم ہوتا تو یہی کرتا۔ تو جب گذشتہ دنوں چیف جسٹس صاحب نے میڈیا کے معززین کی پوری برات کو عدالت میں بلایا اور بظاہر بزرگ، لیکن دل اور دماغ کے پھرتیلے جوان صحافی آئی اے رحمان کو چائے کی صلح ماری تو انھوں نے دھیمے اور اکتائے ہوئے لہجے میں کہا، 'جنابِ والا چائے نہیں، انصاف چاہیے۔' آپ نے کچھ سرکاری افسر ایسے بھی دیکھے ہوں گے جہاں آپ کو پتہ ہوتا ہے کہ نہ چائے ملے گی، نہ کام ہوگا، افسر آپ کی عزت افزائی کے بہانے اپنی افسری کی دھاک بٹھاتا رہے گا۔ پہلی بات تو یہ طے ہوگئی کہ وہ جو بابے رحمتے والی بات کرتے ہیں وہ مذاق نہیں۔ وہ واردات کے بعد قانون کی کتابوں میں وقت ضائع نہیں کرتے بلکہ گاؤں کے بڑوں کی پنچایت بلاتے ہیں، اور حقہ تازہ کر کے پوچھتے ہیں کہ 'ہور کیہ حال اے، تہاڈا کیہ خیال اے۔ میر صاحب آپ، خان صاحب آپ کی کیا رائے ہے؟ وڑائچ صاحب تسی کیوں چپ او؟'

یہ ایسا ہی معصومانہ انصاف ہے جیسے مریض ڈاکٹر کے پاس جائے اور ڈاکٹر ہسپتال کے سارے مریضوں کو اکٹھا کر کے پوچھے: 'چونکہ آپ سب تجربہ کار مریض ہیں اس لیے آپ ہی کوئی علاج کا طریقہ بتائیں۔'

پہلے تیز بچے بڑے ہو کر سونے کا سمگلر بننا چاہتے تھے، یا خلانوردی کرنے چاہتے تھے، اب بڑے ہو کر اینکر پرسن بننا چاہتے ہیں۔ میڈیا کی یہ دیومالا اتنی تیزی سے پھیلی ہے کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل کئی ٹی وی پروگراموں میں ایک اینکر پرسن دوسرے اینکر پرسن سے پوچھتا ہے کہ جو تیسرے اینکر پرسن نے بات کی تھی اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

لیکن بڑے سے بڑا اینکر پرسن بھی اپنے ایک شو میں زیادہ سے زیادہ تین یا چار اینکر پرسن ہی اکٹھے کر پاتا ہے۔ اب گنیں چیف جسٹس صاحب نے اپنے پروگرام میں کتنے اکٹھے کیے۔ حسد کے مارے کچھ صحافی اینکر اکثر کہتے ہیں کہ آج کل کے ٹاک شوز میں صحافت نہیں ہوتی بلکہ عدالت لگتی ہے۔ تو بھائیو، اگر ٹاک شو میں عدالت لگ سکتی ہے تو عدالت ٹاک شو کیوں نہیں ہوسکتی؟

ہر پنچایت میں کوئی بڑا ایک چھوٹی سی کام کی بات کر کے چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد لیلیٰ مجنوں کے قصے تو ساری رات چل سکتے ہیں۔ ہمارے صحافیوں اور غیر صحافیوں کو رحمان صاحب کی آواز میں آواز ملانی چاہیے اور آگے بڑھانی چاہیے۔

چائے نہیں انصاف چاہیے۔

بریانی کا وعدہ اللہ نے کیا ہے، آپ سے انصاف چاہیے۔

انتقام نہیں، انصاف چاہیے۔

ظلم پر بہنے والے آپ کے آنسو نہیں چاہئیں، انصاف چاہیے۔

بابوں والی نصیحتیں نہیں چاہئیں، انصاف چاہیے۔

ٹی وی کا ٹکر نہیں چاہیے، انصاف چاہیے۔

شام ڈھلنے کو ہے، عدالت کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے۔ انصاف چاہیے۔

بشکریہ: بی بی سی اردو

کیا ہمارے معاشرے میں صنفی امتیاز موجود ہے؟

تحریر: فوزیہ فوزی پاکستان

یہ موضوع نہ صرف قابل غور ہے بلکہ قابل فکر بھی ہے۔ اب نہیں بلکہ بہت پہلے بھی مرد اور عورت کے حقوق پر آواز اٹھائی گئی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس آواز میں شدت آئی ہے۔ یہ امتیاز صرف ہمارے معاشرے میں ہی نہیں یورپ میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ مگر بات ہم اپنے معاشرے کی کریں گے۔

پڑھا تھا کہ عالمی اقتصادی فورم کی جانب سے جاری کی جانے والی صنفی امتیاز کے ممالک کی فہرست میں پاکستان ان آخر سے دوسرے نمبر پر ہے فہرست میں شامل 145 ممالک میں پاکستان کا نمبر 144 واں ہے۔

کہتے ہیں کہ پاکستان کی کل آبادی میں خواتین کا تناسب 52 فیصد کے قریب ہے۔ مگر عملاً تین سے پانچ فیصد خواتین کی عملی زندگی میں مردوں کے شانہ بشانہ معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ مردوں کو خواتین کی تخلیقی صلاحیتوں کو قبول کرنے میں دشواری ہے۔ اور بہت سے تشدد پسند ذہنیت کے افراد کا عورت پہ تشدد بڑھتا جا رہا ہے۔ مرد اور عورت دونوں بشریت اور انسانیت میں برابر ہے یعنی جس طرح مرد کے عورت پر کچھ حقوق ہے اسی طرح عورت کے مرد پر حقوق ہے جن کی ادائیگی دونوں پر ضروری ہے اللہ نے مرد کو جہاں جسمانی قوت اور طاقت سے نوازا ہے وہی عورت کو رحم دل بنایا ہے۔ جہاں مرد کو اپنے جذبات پر قابو رکھ کر صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت دی ہے وہیں عورت کو حیض، حمل، ولادت، نفاس اور بچے کو دودھ پلانے کے مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں اکثریت بچپن سے ہی لڑکے کی پیدائش پر مٹھائی تقسیم کرتی ہے اور لڑکی پر صبر شکر کیا جاتا ہے۔ لڑکی کو باپردہ رہنے اور نظر نیچی رکھنے پر زور دیا جاتا ہے اور لڑکا کس کے تعاقب میں رہتا ہے۔ کچھ خبر نہیں ہوتی۔ بڑے ہونے تک لڑکے کو ہمیشہ فوقیت دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے مرد ہمیشہ خود کو عورت سے برتر سمجھتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کی عورت کیا زمانہ جاہلیت کی طرح پاؤں کی جوتی سمجھی جاتی ہے؟

بہت سے گھرانے ایسے ہیں۔ جہاں اب بھی عورت سے جانور کی طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جانوروں کی طرح بیچا جاتا ہے۔ دل بہلانے والا ایک کھلونا سمجھا جاتا ہے۔ عورت کو محض ایک اشتہار بنا کر پیش کرنا مردانگی ہے؟ کیا عورت ہمیشہ انسانوں اور رومانوی غزلوں کا موضوع ہی رہے گی؟ عورت کوئی بے جان چیز نہیں ہے بلکہ جذبات و احساسات رکھنے والی ایک ہستی ہے مردوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ عورت ان کے گھر میں سکون کا باعث ہے۔ بچوں کی ماں ہے۔ ان کی خاطر تکلیفیں برداشت کرتی ہے۔ مرد کی بہت سی باتوں کی عورت گواہ ہوتی ہے۔ وہ اس کے اخلاق کا معیار جانتی ہے۔ اگر مرد عورت سے صحیح سلوک نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ صلح صفائی سے نہیں رہتا اس کے حقوق ادا نہیں کرتا تو وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کیسے ادا کرے گا۔ کس منہ سے اللہ سے رحم مانگے گا۔ جبکہ وہ خود اپنی بیوی پر ظلم کرنے والا ہے۔ دراصل صنفی امتیاز ہماری جڑوں میں بیٹھا ہوا ہے یہ بھی درست ہے کہ امتیاز ہر معاشرے کا حصہ رہا ہے۔ اور جہاں تعلیم کا فقدان ہوگا وہاں ایسی ہی سوچ جنم لے گی۔ تعلیمی میدان میں مرد اور عورت کو یکساں مواقع دینے چاہیئں۔ تعلیم کی کمی اور اپنے حقوق سے بے خبری خواتین کو پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ جب تک اپنے حقوق کا علم نہ ہوگا وہ اپنے لیے ہر غلط فیصلے کو آسانی سے قبول کر لیں گی۔ معاشی طور پر بھی کمزور ہونے کی وجہ سے خواتین ہر فیصلے کو قبول کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

آج کی آفس ورکنگ وومن میرے خیال میں مرد سے زیادہ محنت کرتی ہے۔ وہ گھر بھی چلائے۔ بچوں کا بھی خیال کرے اور کمانے کے لئے گھر سے باہر بھی جائے۔ اور اگر گھر ہی رہے پھر بھی بچوں کے گھر کے ساس سسر کے کام کرتی ہے۔ صنف نازک ہونے کے باوجود کولہو کے بیل کی طرح کاموں میں لگی رہے تو اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھانا ایسا بھی غلط نہیں۔ ایک عورت ہونے کے ناطے مجھے اس آواز کے ساتھ آواز ملانی چاہیئے۔ لیکن اگر میں دینی لحاظ سے اسلام کو سامنے رکھ کر بات کروں۔ تو قرآن کریم نے اقتصادیات کی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے۔ اللہ نے عورت کو باحیا اور باپردہ رہنے کا حکم دیا ہے۔ مرد کو عورت پر نگران مقرر کیا ہے۔ جسمانی لحاظ سے بھی عورت اندرونی طور پر مرد کے مقابلے میں کمزور ہے۔ اور دماغی لحاظ سے بھی عورت جذبات سے کام لیتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے کمتر سمجھا جائے۔ اس کے حقوق غصب کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے وجود کو اہمیت نہ دی جائے۔ قوام کے لحاظ سے مرد کی ایک فضیلت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مرد کو ہر پہلو سے عورت پر فضیلت حاصل ہے۔ سب سے پہلے تو لفظ قوام کو دیکھتے ہیں۔ قوام کہتے ہیں ایسی ذات کو جو اصلاح احوال کرنے والی ہو، جو درست کرنے والی ہو، جو ٹیڑھے پن اور کجی کو صاف سیدھا کرنے والی ہو، چنانچہ قوام اصلاح معاشرہ کے لئے ذمہ دار شخص کو کہا جائے گا۔ پس قوامون کا حقیقی معنی یہ ہے کہ عورتوں کی اصلاح معاشرہ کی اولین ذمہ داری مرد پر ہوتی ہے اگر عورتوں کا معاشرہ بگڑنا شروع ہو جائے ان میں کج روی پیدا ہو جائے ان میں ایسی آزادیوں کی رو

چل پڑے جوان کے عائلی نظام کو تباہ کرنے والی ہو۔یعنی گھریلو نظام کو تباہ کرنے والی ہو،میاں بیوی کے تعلقات کو خراب کرنے والی ہو،تو عورت پر دوش دینے سے پہلے مرد اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کیونکہ خدا تعالیٰ نے ان کو نگران مقرر فرمایا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اپنی بعض ذمہ داریاں اس سلسلے میں ادا نہیں کیں۔یوں کہنا چاہیئے کہ اگر عورتوں میں بعض برائیاں پیدا ہوئی ہیں تو تمھاری نااہلی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسلام نے عورت کو ایک عظیم معلمہ کے طور پر پیش کیا ہے صرف گھر کی معلمہ کے طور پر نہیں بلکہ باہر کی معلمہ کے طور پر بھی۔ایک حدیث میں حضرت اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عائشہ سے سیکھو اور جہاں تک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ کی روایات کا تعلق ہے وہ تقریباً آدھے دین کے علم پر حاوی ہیں۔بعض اوقات اپ نے علوم دین کے تعلق میں اجتماعات کو خطاب فرمایا اور صحابہ کرام بکثرت آپ رضی اللہ تعالی عنہ کے پاس دین سیکھنے کے لئے آپ کے دروازے پر حاضری دیا کرتے تھے۔پردہ کی پابندی کے ساتھ آپ رضی اللہ تعالی عنہ تمام سائلین کے تشفی بخش جواب دیا کرتی تھیں۔۔

تو یہ ہے عورت کے مقام کا وہ حسین تصور جو اسلام نے پیش کیا ہے۔جس سے ایک سلجھی ہوئی قابل احترام شخصیت کا تصور ابھرتا ہے۔

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جس کا اپنے اہل کے ساتھ عمدہ سلوک ہے۔بیوی کے ساتھ جس کا عمدہ چال چلن اور معاشرت اچھی نہیں وہ نیک کہاں! دوسروں کے ساتھ نیکی اور بھلائی تب کرسکتا ہے جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ عمدہ سلوک کرتا ہو۔اور عمدہ معاشرت رکھتا ہے۔نہ یہ کہ ہر ادنی بات پہ زدوکوب کرے۔

دوسری طرف یہ بھی درست ہے کہ خاوند عورت کے لئے اللہ تعالیٰ کا مظہر ہوتا ہے۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے سوا کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔پس مرد میں جلالی اور جمالی رنگ دونوں موجود ہونے چاہئیں۔صرف یہ نہیں کہ ہر وقت جلال ہی دکھاتا رہے عورت کے یہ حقوق ہیں جو اسلام قائم کر رہا ہے اور آج مغرب کی آزادی کے علمبردار عورت کی آزادی کے نعرے لگاتے ہیں جس میں آزادی کم اور بے حیائی زیادہ ہے اور بعض لوگ ان کے ان کھلے نعروں کے جھانسے میں آکر آزادی کی باتیں کرنی شروع کر دیتے ہیں آزادی تو آج سے چودہ سو سال پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دلوائی تھی۔جس کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے بخاری کی روایت ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے۔فرماتے ہیں کہ ہمارا حال یہ ہوگیا تھا"کہ ہم اپنے گھروں میں اپنی عورتوں سے بے تکلفی سے گفتگو کرتے ہوئے ڈرنے لگے تھے کہ کہیں یہ شکایت نہ کردیں۔

اگر اللہ نے مرد کو یہ اہمیت دی کہ نبوت و رسالت ہمیشہ مردوں کو منتخب کیا تو دوسری طرف جنت ماں کے قدموں تلے رکھ کر عورت کو بھی ماں کی حیثیت سے مرد پر فوقیت دی۔۔یہ بھی سچ ہے کہ سرحدوں کی حفاظت کے لئے عورتوں کی فوج بنا کر نہیں بھیجی جا سکتی۔مرد کو سربراہی حاصل ہے پر دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل حیثیت اور مقام رکھتے ہیں۔عورتوں کو صنف نازک کہا گیا ہے۔بلکہ عورتیں بھی خود کو صنف نازک تسلیم کرتی ہیں کہ بعض قوی مردوں سے کمزور ہوتی ہیں۔مرد کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔تو جب اللہ تعالی نے کہہ دیا کہ میں تخلیق کرنے والا ہوں اور مجھے پتہ ہے کہ میں نے کیا بناوٹ بنائی ہوئی ہے مرد اور عورت کی اور اس فرق کی وجہ سے میں کہتا ہوں مرد کو عورت پر فضیلت ہے تو اعتراض ہوتا ہے کہ دیکھو جی اسلام نے مرد کو عورت پر فضیلت دے دی۔عورتوں کو تو خوش ہونا چاہیئے کہ یہ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے مرد پر زیادہ ذمہ داری ڈال دی ہے۔اس لحاظ سے بھی کہ اگر گھریلو چھوٹے چھوٹے معاملات میں عورت اور مرد کی چھوٹی چھوٹی چپقلشیں ہوجاتی ہیں۔ناچاقیاں ہوجاتی ہیں۔تو مرد کو کہا کہ تمھارے قویٰ مضبوط ہیں،تم قوام ہو،تمھارے اعصاب مضبوط ہیں۔اس لئے تم زیادہ حوصلہ دکھاؤ۔اب یہ باتیں مردوں کو سمجھنی چاہیں۔نہ کہ ان باتوں پر فخر محسوس کر کے عورت کو کمتر سمجھا جائے۔

اسلامی معاشرے میں عورت کا ایک بلند مقام ہے۔انھیں اپنے مقام کو پہچاننا چاہیئے۔اگر ایسا نہ کیا تو اس بات کی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ ان کی آئندہ نسلیں ایمان پر قائم رہیں گی۔خواتین دینی اور دنیاوی علوم لازمی حاصل کریں۔ان کا صرف یہی مقام نہیں ہے کہ مارکیٹ میں جا کر کچھ چیزیں لے آئیں۔بیچ آئیں اور آپ کے بچوں کو سنبھالیں۔۔بلاشبہ بچوں کی ذمہ داری زیادہ ماں پر ہے۔مگر معاشرے انھیں ان کا مقام دیا جائے۔کیونکہ کسی بھی قوم کے بنانے یا بگاڑنے میں عورت بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔اس لئے بھی کہ مستقبل کی نسلیں اس کی گود میں پرورش پا رہی ہوتی ہیں۔یہ ضروری ہے کہ مرد کو اس بات کا احساس ہو۔نسلوں نے اس کی گود سے پروان چڑھنا ہے۔عورت کے حقوق کو پامال کرنا۔اس پہ گندی نظریں ڈالنا،اس سے ناانصافی کرنا موجودہ دور میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔اور ملتی کیا ہیں۔روز میڈیا پر نشر ہوتی ہیں۔عزتوں کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔کسی بھی ادارے میں دیکھا جاسکتا ہے کہ عورت کی کیسے حق تلفی کی جاتی ہے۔کسی مرد نے کبھی عورت کے لئے آواز بلند نہیں کی۔۔جب عورت کے جائز حقوق غصب کیئے جائیں گے۔ظلم کی انتہا کی جائے گی۔برابری تو کیا اس کی اپنی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔تو تیزی سے ترقی کرتے ہوئے اس دور کی عورت اپنے بچوں اور حقوق کی خاطر آواز بلند کرے گی۔اب یہ اس کی سوچ ہے کہ کس طرح اور کیسے وہ یہ کام کرتی ہے۔

دوسری طرف مساوی حقوق کی بات کرنے والوں کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ کیا مردوں

کی جگہ عورتوں کی فوجیں بنا کر جنگوں میں بھیجی جا سکتی ہیں؟ غرض کہ عورتوں میں مردوں کی نسبت قویٰ کمزور ہیں۔ مگر مردوں کو عورتیں کے جو حقوق ہیں وہ دینا ضروری ہیں۔

عورت مارچ کا جو نعرہ لگایا گیا میں سمجھتی ہوں طریقہ کار غلط تھا۔ جہاں عورت کے حقوق غصب کئے جائیں وہاں اخلاقی و سماجی حدود کے دائرے میں رہ کر اور حکمت سے آواز بلند کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ ظلم کو روکا نہ جائے تو یہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مگر دھونس سے اپنے حقوق لینے کی بات کرنا کسی ذی شعور خاتون کو زیب نہیں دیتا۔

کیا عورت اور مرد کبھی برابر ہو سکتے ہیں،، اس کی وضاحت احادیث سے میں پہلے ہی بیان کر چکی ہوں۔ بعض مرد علمی لحاظ سے اور قوت فیصلہ میں عورت سے کم ذہین ہوتے ہیں۔ مگر مرد ہیں اس لئے ان کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔۔ کسی دفتر میں فیکٹری میں ہر کرسی پر زیادہ تر مرد کا اختیار ہوتا ہے۔ اور جہاں عورت کا اختیار ہو اس دفتر میں سازشی ذہن عورت کو شکست دینے میں سرگرم رہتے ہیں۔ ضروری ہے کہ حکومتی سطح پر اس معاملے پر بات چیت ہو۔ ایسا ممکن اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والوں کا دل پاؤں میں نہ دھڑکتا ہو۔ کہ ان کے دل کی آواز سننے کے لئے پاؤں میں جھکنا پڑے۔ بس مرد اور عورت دونوں حقوق و فرائض کا خیال رکھیں۔ اپنے اندر اسلام کو زندہ رکھیں تو ایسے حالات دیکھنے کو نہ ملیں کہ خواتین بینرز اٹھائے سڑکوں پر نظر آئیں۔ اور نہ صرف اپنے لئے ہنسی ٹھٹھے کا سامان پیدا کریں بلکہ اپنے بزرگوں کے لئے پریشانی اور بچوں کے لئے ایسی بری مثالیں چھوڑیں۔ پردے کی حدود میں رہ کر پروقار طریقے سے اپنے حقوق کے لئے آگے آنے اور آواز اٹھانے میں کوئی برائی نہیں۔۔

سورۃ الاحزاب میں ہے۔ کہ ترجمہ: یقیناً مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں۔ اللہ نے ان سب کے لئے مغفرت اور اجر عظیم تیار کئے ہیں۔

مرد اور عورت کی برابری کی اس سے زیادہ عظیم الشان آیت کہیں دکھائی نہیں دے گی۔ دنیا کی کسی مذہبی کتاب میں آپ کو نظر نہیں آئے گی۔ اس میں مردوں اور عورتوں کے حقوق کو بالکل برابر کر دیا ہے۔ سب کی نیکیوں پر خدا کی یکساں نظر ہے اس لئے یہ خیال کرنا کہ مردوں کو عورتوں پر کوئی فضیلت ہے یا عورتوں کو مردوں پر کوئی فضیلت ہے یہ تصور اسی ایک آیت سے کلیتہ باطل ہو جاتا ہے۔

قارئین کے لیے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور انٹرنیشنل نے قارئین کے لیے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے "ادارہ" پُر عزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاءاللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدردانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد "ہفتہ وار" کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر جنرل (ر) مسعود الحسن نوری صاحب کے سنگ انمٹ نقوش سے بھرپور ''قلعہ نندنہ'' اور ''یادگار اسکندرِ اعظم'' کی سیر

تحریر: ریاض احمد ملک دوالمیال ضلع چکوال

مکرم ڈاکٹر جنرل (ر) مسعود الحسن نوری صاحب کے پاس مجھے اپنی نئی طبع شدہ کتاب ''آثارِ قدیمہ کٹاس'' کو پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف خوشی کا اظہار فرمایا بلکہ اس کے مطالعہ کے بعد میری اس کاوش کو بہت سراہا۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد آپ نے ضلع جہلم اور ضلع چکوال کی سب سے بلند ترین 3500 فٹ چوٹی ''چہل ابدال'' نزدیک بشارت، تحصیل چوآسیدن شاہ، ضلع چکوال کی سیر کی خواہش ظاہر کی کیونکہ اس جگہ ہمارے علاقہ کے محققین کے مطابق حضرت عیسیٰ کے چالیس حواریوں نے کافی عرصہ قیام کیا تھا اور بعد میں وہاں سے کشمیر کی طرف چلے گئے تھے۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ اس مشکل ترین چوٹی پر اللہ تعالیٰ نے مجھے اور دوالمیال کے دوستوں کے ساتھ مل کر اس ''چہل ابدال'' کی چوٹی کی سیر مکرم ڈاکٹر جنرل (ر) مسعود الحسن نوری صاحب کے ساتھ کرنے کی توفیق ملی۔ اور اس سیر کے بعد آپ نے ڈھیروں دعاؤں سے نوازا اور بہت خوشی کا اظہار فرمایا۔ اور ٹیلیفون پر اس کتاب کے مواد کو کافی اہمیت دی اور میری اس ناچیز کاوش کو کافی معلوماتی قرار دیتے ہوئے پسند فرمایا اور مجھ سے ٹیلیفون پر ہی بات کرتے ہوئے اپنی قلعہ نندنا اور ابوریحان البیرونی کی قلعہ نندنا میں رہائش گاہ، مسجد اور قلعہ نندنا میں البیرونی کی تجربہ گاہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ کہ میرا جی بہت چاہ رہا ہے کہ میں قلعہ نندنا کی سیر کروں جس جگہ پر ابوریحان البیرونی نے بہت مدت تک قیام کیا۔ بلکہ نہ صرف قیام بلکہ وہاں پر بیٹھ کر دینِ اسلام کی اس علاقہ میں تبلیغ کا فریضہ بھی سرانجام دیا اور علاقہ کو دینِ اسلام کی روشنی سے منور کیا اور اس کے ساتھ تحقیق و تالیف کا عمل بھی جاری و ساری رکھا۔ اور یہاں اس قلعہ نندنا میں بیٹھ کر اپنی ایک بہت ہے معرکۃ الآراء کتاب ''کتاب الہند'' تالیف کی۔ اور ساتھ ہی اپنی ایک تجربہ گاہ بھی بنائی ہوئی تھی جس میں بیٹھ وہ مختلف تجربات کیا کرتا تھا۔ اور اس قلعہ نندنا کی تجربہ گاہ میں بیٹھ کر اور مختلف زاویوں اور ستاروں کی گزرگاہوں پر تحقیق کا حق ادا کیا اور زمین کا قطر اور محیط بھی ماپ ڈالا۔ اب جدید دور کی تحقیق نے جو زمین کا محیط اور قطر ماپا ہے۔ اس میں صرف چند میل کا فرق ہے۔ اور اس کے ساتھ البیرونی نے یہ بھی اپنی تحقیق میں لکھا ہے کہ پوٹھوہار کا یہ علاقہ زمین کا مرکز ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی ہندو کلچر اور روایات پر بھی روشنی ڈالی اور گراں قدر تجربات اور انکشافات بھی کئے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے اگر یکم نومبر کو فراغت ہو تو بہتر ہے کہ اس دن اس قلعہ نندنا اور ساتھ کے ملحقہ تاریخی مقامات کی سیر کر لی جائے۔ میں نے تو اپنی خوش نصیبی سمجھی کہ محترم ڈاکٹر صاحب نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں ان کے ساتھ قلعہ نندنا کی سیر کروں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ باغانوالہ گاؤں جو قلعہ نندنا کے پہاڑ کے نیچے آباد ہے وہاں تک تو گاڑی پہنچ جائے گی۔ لیکن آگے تقریباً تین کلومیٹر سیدھی چڑھائی ہے اور اوپر چڑھنے کو کوئی خاص راستہ نہیں۔ ایک پگڈنڈی سی ہے جس پر چڑھ کر جانا ہوگا اور اتنی مشکل چڑھائی آپ کے لئے چڑھنا مشکل ہوگی۔ صرف باغانوالہ تک جا کر نیچے ہی سے قلعہ کو دیکھ کر اور فوٹو لے کر آیا جا سکتا ہے اس پر ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ جب سے آپ کی کتاب ''آثارِ قدیمہ کٹاس'' پڑھی ہے اور اس میں البیرونی کا پڑھا ہے کہ اس نے کٹاس کی سِتگرا یونیورسٹی میں مختلف علوم اور سنسکرت زبان کی تعلیم حاصل بھی کی ہے۔ کٹاس اور

قلعہ نندنا میں اور اس کے نواح میں اپنے تجربات بھی کئے ہیں اور اس کا مسکن قلعہ نندنا میں رہا ہے تو جی چاہ رہا ہے کہ اس کو بنفسِ نفیس دیکھوں اور البیرونی کے قدموں پر قدم مار آؤں۔ اور اس جگہ پر بیٹھوں جہاں سے البیرونی بیٹھ کر سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے سماں کا نظارہ کرتا تھا اور سورج کے راستے کی کمان کو دیکھ کر اپنے تجربات کرتا اور جس کی تحقیق ساری دنیا کے لئے مشعلِ راہ ہے اور قلعہ نندنا بھی انہیں تحقیقات کا منبع ہے کیونکہ اسی قلعہ میں رہ کر ہی البیرونی نے یہ کارنامے سرانجام دیئے۔ میری خواہش ہے کہ میں اس قلعہ کو ضرور دیکھوں اور یکم نومبر کو اپنا پروگرام بنالیں انشاء اللہ ہم ملکر اس قلعہ کی سیر ضرور کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے ان مصمم ارادوں اور تاریخی قلعہ نندنا کی سیر کی چاہت اور امنگ پر مجھے بہت رشک آیا۔ اور میں نے یکم نومبر کو قلعہ نندنا آپ کے سنگ دیکھنے کا پکا پروگرام بنالیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک اور مشورہ دیا کہ کیوں نہ اس کے ساتھ ڈاکر احمد حسن دانی صاحب کی کوششوں سے بنائی گئی اسکندرِ اعظم کی اس یادگار کو بھی دیکھ لیا جائے جو جلال پور شریف کے قریب بنائی گئی ہے۔ جس کو آپ نے قبول کرتے ہوئے فرمایا ٹھیک ہے اسے بھی دیکھ ڈالیں گے۔ اور نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ یکم نومبر کو ساڑھے نو بجے پنڈ دادنخان پہنچنے کا پروگرام ٹیلیفون پر ڈاکٹر صاحب سے طے پا گیا۔ اور یوں یکم نومبر کو ہماری گاڑی دوالمیال سے روانہ ہو کر جس میں نوید احمد صاحب، مکرم عمران احمد صاحب، مکرم عدنان شہزاد صاحب، خاکسار (ریاض احمد ملک) شامل تھے۔ ہم مقررہ وقت پر سلطان سی این جی پنڈ دادنخان پہنچ گئے۔ اور ڈاکٹر صاحب کی گاڑی بھی بروقت للہہ انٹرچینج سے اتر کر مقررہ مقام پر پہنچ گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ عطاء الرب صاحب اور ڈرائیور جلال احمد صاحب (طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ) سے تھے وہاں سے یہ پروگرام طے پایا کہ قلعہ نندنا پہلے دیکھیں گے اور بعد میں اسکندرِ اعظم کی یادگار کی سیر کی جائے گی۔ یوں یہ قافلہ تاریخی قلعہ نندنا کی جانب دعا کے بعد روانہ ہوا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب نے ازراہِ شفقت اپنی گاڑی میں بٹھا لیا اور قلعہ نندنا کی تاریخ کے بارے میں جو مجھے علم تھا میں نے آپ کو بتایا اور اس علاقہ کی تاریخ اور تاریخی مقامات کے متعلق ڈاکٹر صاحب کو بتایا۔ آپ فرمانے لگے کہ ملک صاحب آپ کے ساتھ سیر کرنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں ان کے ساتھ سیر کروں اور قلعہ نندنا دیکھوں۔ قافلہ منزل کی جانب چلتا رہا اور منزل قریب آنے لگی۔ ہمارے حوصلے اور عزم جواں تھے۔ دل میں ایک امنگ تھی اور اللہ پر کامل یقین تھا کہ ہم نے اس مقام پر جانا ہے جس جگہ البیرونی نے دنیا کو حیرت میں ڈال دینے والے انکشافات کئے تھے اور اپنی کتاب ''کتاب الہند'' تصنیف کی تھی۔ باغانوالہ کسی زمانے میں ایک مشہور تاریخی گاؤں تھا اور اس کا قلعہ نندنا مقامی لوگوں کے لئے بہترین دفاعی مرکز اور ہر حملہ آور کے بہت ہی اہمیت کا حامل تھا۔ اب سفر جاری اسی قلعہ نندنا کی جانب۔ ڈھریالہ جالپ سے ایک کلومیٹر آگے ایک سڑک شمال کی جانب غریب وال سیمنٹ فیکٹری کی طرف جاتی ہے۔ قافلہ اس کی طرف مڑ گیا۔ تقریباً چار کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا بورڈ باغانوالہ کی جانب نشان دہی کر رہا تھا۔ اس کی طرف ہم نے گاڑیاں موڑ دیں۔ ایک چھوٹی سی سڑک کافی ٹوٹی پھوٹی ہوئی۔ ان پر ہچکولے کھاتی ہوئی گاڑیاں چلے جا رہی تھیں باغانوالہ کی جانب جو وہاں سے دو کلومیٹر دور تھا۔ محکمہ آثارِ قدیمہ کو داد دیتا ہوں کہ انہوں کہیں پر بھی اس قلعہ کی نشان دہی کا سائن بورڈ لگانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ جو بیشک پرانے ہوں البیرونی نے بیشک وہاں اپنے تجربات، تصنیفات اور انکشافات سے دنیا کو حیرت زدہ کیا ہو۔ وہاں محمود غزنوی جیسے بہادر سپہ سالار نے فتوحات کی ہوں۔ یار اُن کو ان پہاڑوں پر بنے قلعوں سے کیا غرض اگر انہوں نے کارنامے سرانجام دینے تھے تو بڑی شاہراہوں اور بڑے بڑے شہروں اور مشہور جگہوں پر جا کر اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے تاکہ وہاں محکمہ آثارِ قدیمہ والوں کو آسانیاں ملتیں اور وہ اس کی دیکھ بھال بھی اچھی طرح کرتے۔ ان پہاڑوں اور جن پر نہ راستہ گاڑی نہ پیدل جانے کا۔ خواہ مخواہ اس تحقیق کی تشہیر کر کے اس کو منظرِ عام پر لا کر اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ شاید محکمہ آثارِ قدیمہ والوں کو یہی پسند ہے کہ یہ قلعہ جو اتنی اہمیت کا حامل ہے جس کی اہمیت کا انہیں بھی احساس ہے لیکن وہ اپنی سہولتوں کو قربان نہیں کرنا چاہتے۔

اب ہمارا قافلہ باغانوالہ میں داخل ہو چکا تھا۔ وہاں ایک گورنمنٹ پرائمری سکول کے پاس کھڑے ہو کر قلعہ نندنا کے راستے کی معلومات لیں۔ تو پتہ چلا کہ بس دو فرلانگ تک گاڑی جائے گی پھر قلعہ تک پیدل ہی جانا ہوگا۔ بحر حال ان کی معلومات کے مطابق دو فرلانگ تک پہنچ گئے اور گاڑیاں روک دی گئیں۔ اور باہر اترے سامنے پہاڑی کی چوٹی پر قلعہ نندنا نظر آ رہا تھا۔ جس پہاڑی چوٹی پر چڑھنے اور قلعہ نندنا دیکھنے کا عزم لئے آج ہم ڈاکٹر نوری صاحب کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ اتر کر جب قلعہ پر نظر دوڑائی تو راستہ کا کوئی نام و نشاں نہ تھا۔ ایک بڑا سا نالہ جس میں اوپر سے آئے ہوئے بڑی بڑی جسامت کے پتھر پڑے نظر آئے اور ساتھ میٹھا پانی جو اوپر چشموں سے آ رہا تھا وہ بہہ رہا تھا۔ وہاں بیٹھ کر تھوڑا سا وقفہ لیا اور ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہاں تک آ گئے ہیں اب کوئی بات نہیں اس چڑھائی کی اب اوپر ضرور جائیں گے۔ اور پروگرام اوپر جانے کا پکا بن گیا۔ اب راستہ کٹھن تھا۔ اور خوش قسمتی سے وہاں باغاں والہ کا ایک نوجوان عمران نامی ملا جو البیرونی کالج پنڈ دادنخان میں فرسٹ ائیر کا طالب علم تھا وہ آ گیا اس سے قلعہ پر چڑھنے کے بارے میں معلومات لین تو اس نے بتایا ایک راستہ مشرق سے جاتا ہے اور ایک مغرب سے دونوں ہی راستے کٹھن ہیں۔

بحر حال ہم بھی ہمت ہارنے والے نہ تھے ہم نے بھی اوپر چڑھنے کی پکی ٹھان ہوئی تھی۔ فریش ہونے کے بعد آگے جانے کا پروگرام بنالیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس نوجوان سے پوچھا کہ اس گاؤں سے گھوڑا یا خچر مل سکتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس گاؤں میں کسی کے پاس کوئی گھوڑا اور خچر نہیں ہے۔ ہاں البتہ گدھا اور گدھی سواری کے لئے مل سکتی ہے۔ اسی کو غنیمت جانا کہ بوقتِ ضرورت کام آئے گی۔ اس نوجوان سے کہا کہ وہ ایک گدھی کا انتظام کردے۔ وہ اپنے گھر سے اپنی گدھی لے آیا اس کو ہم نے ساتھ چلنے کو بھی کہا کہ یہ گدھی تمہاری بات مانے گی۔ اور وہ تیار ہوگیا اور یوں یہ قافلہ راونہ ہوگیا قلعہ دیکھنے کو۔ اس گدھی کو میں نے قرونِ اولیٰ کی قدیم سواری کو نام ''شرمیلی'' دیا۔ کیونکہ وہ شرمیلی واقعی عادات واطوار میں خوب شرمیلی تھی۔ جس کو ہم پنجابی میں ''سوو'' کہتے ہیں۔ کچھ وقت پیدل ڈاکٹر صاحب چلے لیکن بڑے بڑے پتھروں کے درمیان سے گزرنا تھا۔ اس لئے ہم نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ آپ اس قدیم سواری پر چڑھ ہی جائیں تاکہ چڑھائی پر پہنچتے پہنچتے آپ اس سواری کو اچھی طرح کنٹرول کر لیں۔ ہماری اس درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے آپ اس سواری پر سوار ہو گئے۔ اس دشوار گزار راستے پر ایسی سواری پر سواری کرنا اتنا آسان نہیں۔ اب چڑھائی شروع ہو چکی تھی اور ڈاکٹر صاحب اس سواری کی سواری لیتے ہوئے جس کی باگ تو تھامی ہوئی تھی اس نوجوان عمران نے اور میں نے اپنا سکارف اتار کر اس شرمیلی کے گلے میں ڈال دیا اور اس کو پکڑ کر ڈاکٹر صاحب اپنا توازن قائم رکھے ہوئے تھے۔ اس قافلہ کے باقی تمام لوگ تو نوجوان تھے بیچ میں ڈاکٹر صاحب کے بعد ستر کی دھائی کا معمر میں ہی تھا۔ میں نے عمران سے درخواست کی کہ مجھے ایک لمبی سی سوٹی توڑ کر دے دیں تاکہ میں اس کے سہارے اوپر چڑھ سکوں۔ اوکھا سوکھا ایسے چڑھ تو رہا تھا لیکن اس سوٹی سے کچھ آسانی ہو جائے گی۔ اب کہاں سے سوٹی ملے۔ کوشش اور تلاش جاری رکھی ایک لاٹھی کے لئے۔ وہاں تو ہر جگہ وہیکڑ (ایک قسم کی ہربل جس کو غالباً حکمت میں ''سوعہ'' کہا جاتا ہے۔ اور جو کافی مرضوں کے لئے اکسیر ہے۔ اور خاص کر اس کے پھولوں کی بنی ہوئی گل قند پیٹ کے امراض کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے پھولوں کا شہد سب سے اچھا مانا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ''چوعرقہ'' کا اہم جز ہے اور قبض کشا ہے۔ اور جس جگہ یہ ہو وہاں تپ دق کی بیماری نہیں ہوتی اس میں سے گزر کر جو پانی آتا ہے اس میں جراثیم نہیں ہوتے۔ اس کے پتے پھوڑوں پر باندھنے سے افاقہ ہوتا ہے) ہی وہیکڑ لگا ہوا تھا اور تمام پہاڑ کو سرسبز بنایا ہوا تھا۔ اس پودے کو کوئی جانور نہیں کھاتا۔ اور سدا بہار پودا ہے یہ سارا سال سبز رہتا ہے۔

اب وہ میرے جیسے بابے کے لئے سوٹی کہاں سے لائیں۔ خیر انہوں نے برخورداری دکھاتے ہوئے تگ ودو ضرور شروع کردی۔ میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ تمام جوان بھی میری طرح مشکل سے ہی چڑھائی چڑھ رہے تھے اور میری طرح ان کا بھی برا حال تھا سورج خوب اپنی تپش دکھا رہا تھا اور پسینہ ٹخنوں سے نکل رہا تھا۔ مجھے پنجابی کا محاورہ یاد آ گیا۔ ''کہ پسینہ گٹیوں پیا چوئے''۔ ان جوانوں کی حالت دیکھ کر میں کچھ وقت کے لئے اپنا رونا بھول گیا۔ بہر حال ان جوانوں کی جانب رحم کی نظر کا سوال ضرور کرنے لگا۔ ہر کوئی اپنی فکر میں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر اوپر چڑھنے کی تگ ودو میں تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب کی فکر تھی۔ اس شرمیلی کی ایک طرف ڈاکٹر صاحب کو آپ کے گارڈ نے سہارا دیا ہوا تھا اور دوسری طرف نوید احمد صاحب نے سہارا دیا ہوا تھا اور یوں یہ پیدل سفر جاری تھا۔ اچانک میری نظر ایک چشمے کی پاس چھوٹی سی بنی دیوار پر پڑی جس کے اوپر ایک چھڑی نما ایک ٹہنی نظر آئی۔ میں نے عمران صاحب کو کہا اور اس نے وہ ٹہنی اٹھا کر مجھے ایک چھڑی بنادی۔ اب تو ریشمان جوان ہوگئی اور نئی سرعت سے چڑھائی چڑھنے لگ گئے۔ یہ رواں قافلہ اب قلعہ کے نزدیک پہنچ ہی گیا کہ شرمیلی نے اڑی لگادی اور مزید آگے اوپر چڑھنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کی کافی منت سماجت کی لیکن اس کی اڑی قائم غرض پھر دھکا لگا کر اس کو مزید اوپر جانے کے لئے مجبور کیا اور وہ مان گئی۔ اب ہم قلعہ نندنا میں پہنچ گئے۔ ہم بہت خوش تھے کہ آخر ہم اپنی منزل پر پہنچ ہی گئے۔ اور ڈاکٹر صاحب بھی کافی خوش نظر آرہے تھے اوپر قلعہ نندنا میں پہنچ کر۔ وہاں اس قلعہ کی حالتِ زار کو دیکھ کر حقیقت میں رونا آیا پہلے اپنی قوم پر۔ پھر آثارِ قدیمہ کے محکمہ پر جنہوں نے صدیوں سے یہاں قدم نہیں رکھا۔ شروع میں ایک مسجد بنی ہوئی ہے جو البیرونی نے بنوائی تھی۔ یہ مسجد دو کمروں پر مشتمل تھی۔ تقریباً ہر کمرہ 25X14 فٹ کا ہے یہ سرخ اور پیلے ریتلے پتھروں کے امتزاج سے بنی ہوئی ہے۔ مشرق کی جانب ایک محراب ساتھ دیئے رکھنے کے طاق۔ ایک خوبصورت قسم کا ڈیزائن۔ لیکن ستم ظریفی یہ کہ اس کے چھت غائب ہیں۔ مدتیں ہوئی ہیں کہ وہاں کسی نے نماز پڑھی ہو۔ بلکہ اس کے محراب کی درمیان سے کسی نے کھدائی بھی کی ہے شاید خزانہ ڈھونڈنے کے چکر میں۔ اور اس کھدائی سے اس مشرق کی دیوار کو پانی کافی نقصان دے رہا ہے اور یوں لگتا ہے کہ موسم کے تھپیڑے بہت کم عرصہ وہ سہہ سکے اور اس کی مشرقی محراب والی دیوار گر جائے۔ اس مسجد میں گائے بھینسوں کا گوبر پڑا ہوا تھا۔ گدھوں کی لید پڑی تھی۔ اور مدتوں سے غیر آباد تھی۔ اس مسجد کی تزئین کو قائم رکھنے کے لئے آثارِ قدیمہ کو ضرور کچھ کرنا چاہیئے ورنہ یہ آثار کچھ ماہ کے مہمان نظر آتے ہیں۔

پھر آگے بڑھے تو قلعہ نندنا کی وہ عمارت اس مسجد سے ملحقہ نظر آئی جس میں مندر کے آثار بھی نمایاں نظر آرہے تھے اور اس کی اگر پرانی تصویر دیکھی جائے تو اس کی تعمیر بالکل کٹاس کے ستگرا مندر کی طرح کے تھے اس سے اغلب یہی گمان ہوتا ہے کہ وہ کٹاس کا ستگرا مندر اور نندنا کا یہ مندر ایک ہی وقت میں بنائے گئے تھے ایک طرف

سے مکمل گری ہوئی یعنی مغرب کی سائیڈ بالکل گری ہوئی اور مشرق والی دیوار ابھی موجود ہے۔ یہ دومنزلہ عمارت جسکے اوپر گنبد نما چھت تھے۔ اس میں سے اندر سے اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں جو ٹوٹی پھوٹی ہوئی ہیں۔ بہر حال ان ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں سے ہم تو اوپر والی منزل تک نہ جا سکے لیکن عمران جو ہمارے ساتھ باغانوالا سے آیا تھا وہ ان سیڑھیوں سے اوپر والی منزل تک چڑھ گیا۔ اس قلعہ میں باہر کی چاروں دیواروں میں درمیان میں بیٹھنے کی ایک جگہ بنی ہوئی تھی۔ قیاس یہی ہے اس جگہ میں بیٹھ کر البیرونی اپنے تجربات کیا کرتا تھا۔ اور سورج کے راستوں کی کمان دیکھ کر اپنے تجربات اور انکشافات کیا کرتا تھا۔ اب ہم بھی وہاں اس مقام پر بیٹھے ہوئے البیرونی کی یاد کو تازہ کر رہے تھے۔ وہاں اپنی فوٹو گرافی کے شوق کو ہم سب نے پورا کیا اور ان یادوں کو تصویروں میں ڈھالا۔ اور داد دی اس قلعہ کے معماروں کو کہ کس ترتیب سے اور کس مضبوطی سے ان کو جوڑ کر اس مضبوط قلعہ کی تعمیر کی کہ ہزاروں سال بعد بھی ستم ہائے زمانہ سہہ کر بھی وہ دیواریں ابھی بھی قائم ہیں۔ اس مقام سے ساتھ کے پہاڑوں کا حسین منظر نظر آیا۔ اور خوب ہم نے نظارے کئے اس علاقہ کے۔ اس سے دریا کے نظارے کئے جا سکتے ہیں اور تمام علاقہ کو خوب اچھے طریقے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ وہاں سے ایک کنجور پتھر میں ایک فاصل بھی نظر آیا جس کی تصویر بھی اتاری اور اس کو محفوظ بھی کیا۔ یہ غالباً کوئی otanical fossel B تھا۔ اس کی عمر تقریباً دو کروڑ سال سے کم نہیں ہوگی۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر پہاڑی چوٹی پر اسی قسم کی ایک اور عمارت بھی ابھی تک موجود ہے۔ جہاں سے مشرقی علاقہ پر پوری نظر رکھی جا سکتی ہے۔

قلعہ کی تاریخ اور تفصیل: ''یہ قلعہ ''نندنا'' یا ''نستا'' کہلاتا تھا۔ 410ھ میں سلطان محمود نے راجہ جے پال کے خلاف جنگ کی اور اس قلعہ پر قبضہ کر لیا شہر کو باغانوالہ کہتے ہیں جو اب چھوٹا سا قصبہ رہ گیا ہے س۔ اس قلعہ پر کئی دور آئے تھے۔ تیرھویں صدی میں قمر الدین کرمانی نے جلال الدین خوازم کے قلعہ دار کو شکست دے کر قبضہ کر لیا۔ 1221ء میں چنگیز خان نے سندھ وادی پر قبضہ کیا۔ تو اس کے ایک آفیسر طور طائی نے قلعہ پر قبضہ کیا اور تمام آبادی کو تہ تیغ کر دیا۔ چھ ماہ بعد سلطان التمش نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔'' (طبقاتِ اکبری)

''نندنا کا مطلب ہے '' اندر کا باغ '' (Indra's Garden) ''
(طبقاتِ ناصری صفحہ 539۔ گیزیٹیر ضلع جہلم 1904ء)

قلعہ نندنا مشتمل تھا۔ مندر۔ قلعہ اور ایک گاؤں پر۔ نندنا کا اسلوبِ تعمیر کشمیری ہے۔۔ مندر جس پلیٹ فارم پر بنا ہوا ہے۔ وہ بہت قدیم لگتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے آثار پر اس کی یہ تعمیر ہوئی ہے۔ یہ مند اس علاقہ اور ضلع میں بنائے گئے مندروں سے مختلف اسلوبِ تعمیر کا حامل ہے۔ جس کا بڑا اندر داخل ہونے کا صدر دروازہ مغرب کی جانب ہے حالانکہ اس ضلع میں اور کٹاس میں بنے ستگرا مندروں کا منہ اور صدر دروازہ کا رخ مشرق کی جانب ہے۔ اس مندر کی مناسبت سکیسر میں بنے ''ایمب مندر'' سے ملتی جلتی ہے۔ جنوب کی جانب قلعہ کے دو گول نما فصیل کی برجیاں (Bastions) کے آثار موجود ہیں۔ اور فصیل کی آثار بھی ملتے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی نے اس قلعہ پر 404ھ، 1008ء میں حملہ کیا۔ ان پہاڑیوں کو ''بالیاتھ کی پہاڑیوں'' کا نام دیا جاتا تھا۔ اور وقت جے پال جو انند پال کا بیٹا تھا وہ لاہور کا حکمران تھا اور یہ قلعہ اس کے زیرِ نگیں تھا۔ محمود غزنوی نے اس قلعہ پر قبضہ کر لیا اور جے پال کشمیر کی جانب بھاگ گیا۔ محمود غزنوی اس قلعہ میں اپنا نائب چھوڑ کر اس کا تعاقب کرتے ہوئے کشمیر پہنچ گیا اور وہاں اس پر فتح حاصل کر کے محمود غزنوی 410ھ میں دوبارہ قلعہ نندنا آیا۔ البیرونی نے اس وقت اس قلعہ میں رہنے کی درخواست کی اور محمود غزنوی نے اسے اجازت دے دی اور خود واپس چلا گیا۔ (گیزیٹیر ضلع جہلم 1904ء)

قلعہ نندنا کے مختلف ادوار: جنرل کننگھم نے لکھا ہے کہ یہ قلعہ تین ادوار سے گذرا ہے۔: (حوالہ ''تاریخ جلالپور شریف گرجاکھ'')

پہلے دور میں پنڈتوں نے علاقہ میں اپنی بالادستی قائم کی۔ اس دور کے مندر جو مخروطی طور پر قائم کئے گئے تھے۔ اور جس کی تعمیر پر جو پتھر استعمال ہوئے ان پر پیپل کے پتا کے نقوش چھاپے گئے تھے۔ اس زمانہ کے چند ایک سکے ابھی تک موجود ہیں۔ جن پر پیپل کے پتا کے نشان چھاپے گئے تھے۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پنڈتوں کی بالادستی بڑی مضبوط تھی۔

دوسرا دور راجہ جے پال جو پال خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس کا تھا۔ اس دور کے مندر علیحدہ نشان دہی کر رہے ہیں اب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعمیر میں شاہانہ انداز رکھا گیا۔

تیسرا دور سلطان محمود غزنوی کا تھا۔ سلطان نے 1014ء میں قلعہ پر حملہ کیا اور ساتویں دن فتح سے ہمکنار ہوا۔ اس میں موجود مسجد اس دور کی ہے۔ جو کہ کبھی فنِ تعمیر کا ایک شاہکار تھی۔ فتح کے بعد سلطان کے ایک مصاحب برہان الحق البیرونی نے قلعہ میں سلطان محمود غزنوی سے اس قلعہ میں قیام کی اجازت چاہی جو کی بخوشی سلطان نے منظور کر لی۔ اور البیرونی نے اس قلعہ کو اپنی رہائش گاہ بنا لیا۔ البیرونی نے اس قلعہ میں اپنی تحقیق کو جاری رکھا اور اپنی مشہور کتاب ''کتاب الہند'' بھی یہیں تصنیف کی۔ اور کرہ ءِ ارض کی پیمائش کی اور ثابت کیا زمین کا قطر 15836508 میل ہے۔ پیمائش کے اوزار جن کو ''اضطرلاب'' کہا جاتا تھا۔ ان کی شکلیں عجیب و غریب تھیں اور ہندوؤں نے ان کو کمانیں پکارا۔ (''تاریخ جلالپور شریف گرجاکھ'')

قلعہ نندنا میں زیادہ آبادی شودروں پر مشتمل تھی۔ جو کہ پنڈتوں کے رحم و کرم پر زندگی

گذارتے تھے شودروں میں سے سب سے پہلے ایک خاندان ''بدھو'' نے اسلام قبول کیا۔ اس خاندان ''بدھو'' کی ایک بیٹی چمبیلی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ مذہب اسلام چونکہ سادہ خوبصورت اور پاکیزہ فطرت تھا جس پر چمبیلی نے اس کو دل سے قبول کیا۔ اور وہ پہلی مبلغہ قرار پائی۔ پروہت رام دیال نے جو ذہنی طور سے اس نئے مذہب سے نفرت کرتا تھا۔ چمبیلی کو زہر دلوادی جو کئی دن سے بے ہوش رہی۔۔ البیرونی جو علمِ طب کا ماہر تھا چمبیلی کا علاج کیا اور صحت یاب ہوگئی۔ اس طریقہ علاج سے شودر اتنے متاثر ہوئے کہ کئی خاندان مسلمان ہوگئے۔

(''تاریخ جلالپور شریف گرجاکھ'')

قلعہ نندنا میں پانی کی شدید قلت تھی پانی دور سے لانے کی ذمہ داری شودروں پر تھی۔ جنہیں کوڑوں کے سائے میں لے جاکر پانی لانا پڑتا۔ پنڈتوں کا عقیدہ تھا کہ کوہستانِ نمک میں پانی کا تمام ذخیرہ کٹاس راج کے نیچے ہے۔ اور یہ پوتر پانی جو کی شیو مہاراج کی آنکھوں سے جاری ہوا ہے یہ آنسو پاربتی کے فراق میں تھے۔ اس واسطے یہ مقدس پانی سوائے ہندوؤں کے کوئی اور مذہب استعمال نہیں کرسکتا۔ اس عقیدہ کو باطل کرنے کے لئے البیرونی نے قلعہ میں جو چٹانیں موجود تھیں ان کا مطالعہ کیا اور ان پر تحقیق کی اور ایک دن چمبیلی کو ہمراہ لے جاکر ایک چٹان کے نیچے کھودنے کو کہا۔ چمبیلی نے تھوڑا ہی کھودا تھا کہ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا دھارا بہہ نکلی جس پر پروہتوں نے البیرونی کو ''ودیا ساگر'' کا خطاب دیا۔ (''تاریخ جلالپور شریف گرجاکھ'')

''اس قلعہ کا حدود اربعہ تقریباً 18 کلومیٹر تھا۔۔۔ اس کا صدر دروازہ سنگِ سرخ سے بنا ہوا تھا اور 25 فٹ بلند تھا۔۔۔ پہاڑی چوٹیوں کے درمیان جہاں یہ قلعہ بنایا گیا ہے یہاں سے ایک سرنگ بنائی گئی تھی جو قلعہ کسک میں زیرِ زمین جاتے ہوئے قلعہ کی مشرقی اور عمودی دیوار کے اندر جاکر ختم ہوجاتی ہے۔ فی الوقت یہ سرنگ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں مکمل طور پر بند ہوچکی ہے۔ 6 کلومیٹر کا فاصلہ زیرِ زمین تھا اس میں سے گھڑ سوار بھی سفر کرسکتے تھے۔ آن کی آن میں ادھر سے ادھر آجاسکتے تھے۔ اور ایک دوسرے تک خبر پہنچادیتے۔ اس طرح جنگی نقطہ نگاہ سے قلعہ نندنا اور قلعہ کسک کی اہمیت اور بھی واضح ہوجاتی تھی۔ جنوبی ہند کی جانب سے آنے والی یلغار کو نندنا کے مرکز سے روکا جاتا تھا اور شمال سے یلغار کو قلعہ کسک کے ذریعے روکا جاتا تھا۔ یہ دونوں قلعے ایک ہی عرصہ میں بیک وقت تعمیر کئے گئے۔'' (سالٹ رینج میں آثارِ قدیمہ۔ صاحبزادہ سلطان علی ذوالفی گیلانی۔ اسد علی پرنٹر راولپنڈی، مئی 1998ء)

اس کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا وہی چشمہ جس کو البیرونی نے چٹانوں کا مطالعہ کرکے دریافت کیا تھا۔ جاتے ہوئے مشرقی راستہ استعمال کیا گیا۔ واپسی پر مغربی راستہ اپنایا گیا کہ شاید یہ پہلے راستہ سے سہل ہو۔ لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی یہ اس سے بھی کٹھن راستہ تھا۔ بہر حال کہتے ہیں کہ مشکلیں ہے ہوتی ہیں آسانیوں کی دلیل۔ یہ ضرور ہوا کہ اب چشمے کے پانی کے ساتھ چلتے آئے۔ اور یہ سفر بھی کٹ گیا ہمارا بھی اور ڈاکٹر صاحب کا بھی کبھی شرمیلی پر سواری کرکے کبھی پیدل چل کر۔ دعائیں بھی ساتھ کرتے رہے کہ ڈاکٹر صاحب خیر خیریت سے نیچے گاڑیوں تک پہنچ جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ہمت کو داد دیتا ہوں کہ انہوں نے اس عمر میں اس قلعہ نندنا پر چڑھ کر اس کی سیر کی۔ بلکہ یہ کہنا موزوں ہے کہ ان کی ہمت کی بدولت ہم نے بھی اس قلعہ کی سیر کرلی۔ اب ہم اپنی گاڑیوں کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اور عمران باغانوالہ کا شکریہ ادا کیا اور خاص کر اس کی سواری شرمیلی کو بھی ہم نے تشکرانہ نگاہوں سے دیکھا اور اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے ایک سپیشل یادگار فوٹو بنوائی۔ اور وہاں سے اگلی منزل کے لئے روانہ ہوئے۔ تقریباً 20 کلومیٹر پر جلالپور شریف پہنچے پل سے پہلے اسکندرِ اعظم کی یادگار کی سائن بورڈ تھا جس کو بمشکل پڑھا جاسکا کیونکہ اس کے اوپر الیکشن والوں نے اپنے اشتہاروں کی تہہ چڑھا رکھی تھی۔ پتہ نہیں وہ الیکشن میں کامیاب ہوئے یا نہیں لیکن اس سائن بورڈ کو چھپانے میں وہ کامیاب ضرور ہوئے۔ جلال پور شریف کا قدیم نام گرجاکھ ہے۔ یہ لفظ سنسکرت کا ہے۔ ''گر'' معنی پہاڑ، اور ''جاکھ'' معنی آبادی یا پہاڑی۔ پس گرجاکھ کا مطلب ہوا ''پہاڑوں کے دامن میں بسنے والی آبادی''۔ گرجاکھ، یہ آبادی پہاڑ کے دامن میں تھی۔ جلال پور شریف کے قریب ''چھڑ بلہوں'' میں ایک قبرستان موجود ہے جو قدیم قبرستان ہے۔ قبرستان کے غرب کی جانب آبادی میں داخل ہونے کا رستہ تھا۔ تنگ گلیاں گزرنے کے بعد آپ ایک بڑے مکان کے دروازے پر پہنچیں گے۔ جس کا دروازہ جنوب کی سمت ظاہر ہوتا ہے۔ مکان کے اندر داخل ہونے پر احساس طاری ہوگا کہ ہم کسی عبادت گاہ میں داخل ہورہے ہیں۔ جہاں دیوتاؤں کی قربانی دی جاتی ہوگی۔ پھر آپ مغرب کی طرف چلتے ہوئے آپ کی نظر ایک مسجد پر ٹھہرے گی۔ جس کی دیواریں سرخ تراشیدہ پتھر سے تعمیر کی گئی تھیں۔ محرابی دیوار میں محراب۔ سامنے کی دیوار پر کچھ ایسے نقوش جن سے ثابت ہوگا کہ یہاں برآمدہ ہوگا۔۔ اس مسجد کو سلطان محمد تغلق کے عہد میں بنایا گیا تھا۔ مسجد سے باہر آکر آپ مغرب کی سمت چلیں تو کشادہ آبادی میں داخل ہوں گے اور یہ سلسلہ باغانوالہ تک چلتا جائے گا۔ (تاریخ جلالپور شریف ''گرجاکھ''، غلام نبی قاضی، جہلم پرنٹنگ پریس جہلم، بارِ اول 1982ء)

''گرجاکھ'' دنیا بھر کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک شہر ہے۔ موجودہ جلال پور سے 3/4 گنا بڑا تھا۔ آئینِ اکبری میں ابوالفضل نے صوبہ سندھ ساگر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گرجاکھ صوبہ سندھ ساگر میں ایک بہت بڑا قدیم ترین شہر ہے۔ غالباً یہ صحیح ہے کہ موجودہ جلال پور۔ جلال الدین اکبر کے نام سے رکھا گیا۔ ''منگلا ڈٹی'' کی

چوٹی پر جنجوعہ قلعہ کو ابھی تک گرجاکھ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ شہر گرجاکھ مغرب کی طرف بڑی مسافت تک پھیلا ہوا تھا۔ کیونکہ جو آبادی پہاڑ سے لے کر نیچے آباد ہوئی ہے۔ اگر برساتی نالے ایک دوسرے کے درمیان نہ ہوتے تو ابھی تک جلالپور باغانوالہ تک ہوتا۔ ''ڈیویڈ روس'' نے لکھا ہے۔ پنڈ دادنخان کسی زمانہ میں بڑا گنجان کا رتھا۔ اس ضلع میں قلعوں اور مندروں کے کھنڈرات کثرت سے دکھائی دیتے ہیں۔ آج بھی دارا پور کے جنجوعہ راجپوتوں کے شہر گرجاکھ کی عظیم فصیلیں اور ان کے پتھر دیکھے جا سکتے ہیں۔ باغانوالہ کے قدیم مندروں اور قلعوں کے نشانات موجود ہیں۔ جو اسی قبیلہ کی ملکیت میں تھے۔ اس علاقہ میں سلوئی۔ چوآ کے خوبصورت باغات۔ کسک کے قلعہ میں رنجیت سنگھ نے چھ ماہ تک جنجوعہ راجپوتوں کے آخری سلطان کا محاصرہ کئے رکھا۔ مگر پانی کی فراہمی نہ ہو سکنے سے ہتھیار ڈال دیئے۔

(جنرل کنگھم۔ گیزیٹیر ضلع جہلم 1904ء)

اس موڑ سے دو کلومیٹر پر وہ خوبصورت ''اسکندرِ اعظم کی یادگار'' بنی ہوئی ہے جس کو ڈاکٹر احمد حسن دانی نے یونانی سفارت خانے اور دوسرے معاونین کی مالی معاونت سے بنوایا ہے۔ بہت ہی خوبصورت اولمپک ستونوں والی تعمیر۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پر سکندر اعظم نے بیٹھ کر پورس پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ یہ یادگار تو بنا دی ڈاکٹر احمد حسن ڈانی نے۔ لیکن اب وہاں تالے نظر آئے اس کو سنبھالنے والے اور اس تعمیر کو دکھانے والے غائب۔ بادلِ ناخواستہ باہر سے ہی فوٹو لیتے رہے اور دل کو تسکین پہنچاتے رہے۔ تصویر کشی کرنے کے بعد واپسی کا سفر جاری کیا اب پیٹ میں چوہے ناچ رہے تھے بھوک کی وجہ سے۔ قافلہ کے منتظمین سے گزارش کی کہ کچھ تو خیال رکھیں ہماری بھوک کا، تو جواب ملا کہ سٹنڈرڈ کا ہوٹل نہیں مل رہا ہے اب پنڈ دادنخان جا کر کھانا کھایا جائے گا۔ یہ خبر سن کر دل کو سکون ملا کہ ان کے پروگرام میں کھانا بھی شامل ہے۔

''پنجاب کے شمال مغرب کے حصہ میں کوہستانِ نمک کا سلسلہ ہے۔ اس کے ساتھ مہا بھارت کی بہت سی روایات وابستہ ہیں۔ سکندرِ اعظم نے ضلع راولپنڈی میں ''اوہند'' کے مقام پر دریائے سندھ عبور کیا۔ ''تک شیلا'' کے مہاراجہ نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ پھر گرجاکھ (جلال پور) سے دریائے جہلم عبور کیا اور بالائی پنجاب کے راجپوت راجہ پورس یا پورو کو شکست دی۔ دو شہروں کی بنیاد رکھی۔ ''نکایا'' اور ''بُکے فالس''۔ نکایا کو آج کل ''مونگ'' کہتے ہیں۔ جو فتح کی خوشی میں آباد کیا۔ اور بُکے فالس موجودہ دلاور۔ یہ دونوں شہر گرجاکھ سے چھ میل مشرق کی جانب واقع ہیں۔''

(''تاریخ جلالپور شریف گرجاکھ'')

اب قافلہ واپس پنڈ دادن خان شالیمار ہوٹل کے سامنے رکا۔ اور وہاں ڈاکٹر صاحب کو کھانا کھلایا چار بج چکے تھے اب ہماری صوابدید پر تھا کہ ہم لنچ کریں یا ڈنر۔ شالیمار والوں کا بھلا ہو کہ انہوں نے مصالحے ذرا کم ہی رکھے اور کھانا زیادہ مزیدار تھا یا ہمیں بھوک زیادہ لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی کھانے کی کافی تعریف کی اور خوب سیر ہو کر کھایا۔ بلکہ مرغ سے زیادہ فرائی دال آپ کو زیادہ مزے دار لگی اور آپ نے مزید فرمائش کی مجھے بھی بہت مزیدار لگی تھی تو میں نے بھی حامی بھری اور پھر فرائی دال کو مزے لے کر کھایا۔ اب سیر اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب کو دعاؤں کے سنگ الوداع کیا اور وہ پنڈ دادن خان للہہ انٹرچینج کی جانب روانہ ہو گئے اور ہم اپنی گاڑی میں دوالمیال کی جانب اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ڈاکٹر صاحب اور ہم بھی بخیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ سیر ہمارے دلوں میں ایک انمٹ نقوش چھوڑ گئی۔ اور یہ لمحے ہماری زیست کے گولڈن لمحات تھے جو ہم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گزارے۔ جاتے جاتے ہم نے آپ کو قلعہ ملوٹ دیکھنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔ جو انہوں نے صدقِ دل سے قبول فرمائی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو لمبی زندگی سے نوازے اور یوں ہی وہ انسانیت کی خدمت کرنے کے ساتھ خوش و خرم رہیں اور یوں ہی سیر و سیاحت کرتے رہیں۔ اور ہمیں بھی اپنی سیر میں شامل کرتے رہیں۔ (آمین)

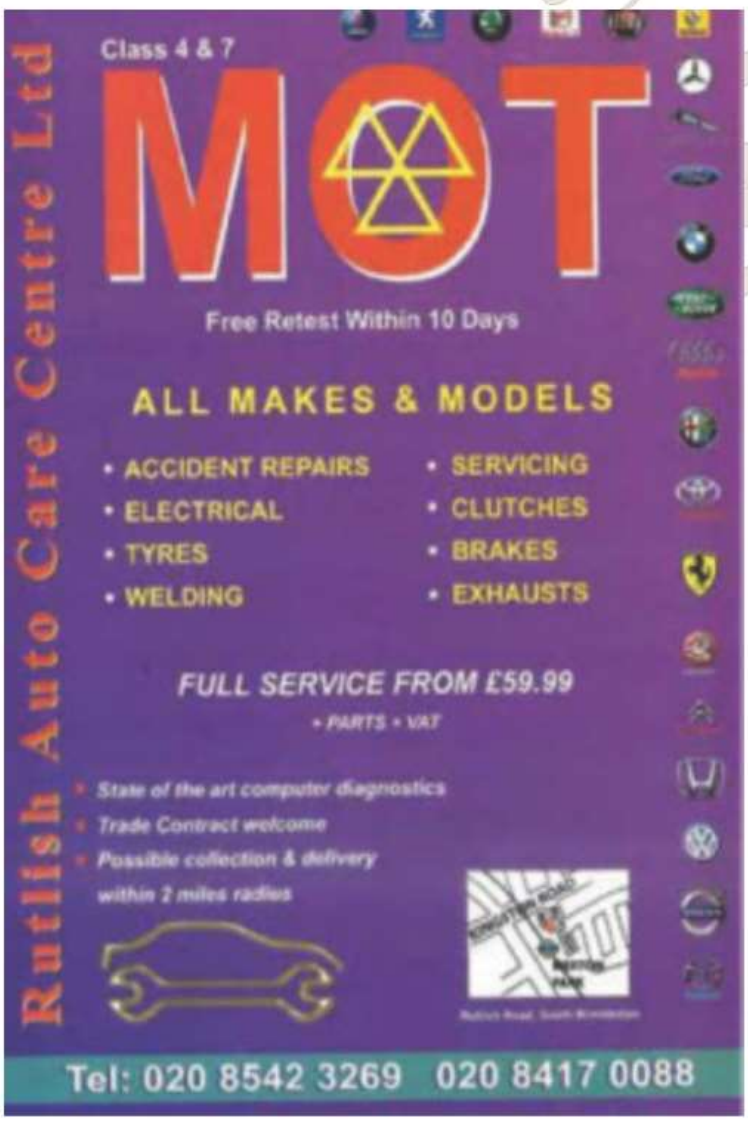

ہفت روزہ لاہور کا اجراء ثاقب زیروی کی زبانی

لاہور میں کافی ہاؤس نامور ادیبوں اور شاعروں کی فکری جولانگاہ کا کام دیتا تھا۔ مولانا چراغ حسن حسرت، عبداللہ بٹ، احسان دانش اور بعض دوسرے نامور ادیبوں اور شاعروں سے کافی کے کپ پر علمی گپ شپ رہتی۔ ایک دن ایسی ہی ایک نشست میں مولانا چراغ حسن حسرت نے (جو امروز اخبار کو خیر آباد کہہ چکے تھے) باتوں باتوں میں یہ تجویز پیش کی کہ ''شیرازہ جیسا ایک ہفتہ نامہ ہونا چاہیے جو نیم سیاسی سا ہو لیکن ''لاہور'' کی علمی و ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا احاطہ بھی کرے۔''

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا ''اگر آپ جم کر ڈیسک پر بیٹھنے کی حامی بھر لیں تو میں شیخ غلام علی اور فلاں فلاں سے دس پندرہ ہزار روپے جمع کر لونگا۔ کچھ عرصے کے بعد یہ ہفت نامہ اپنی جگہ بنا لے گا۔'' مَیں نے حامی بھری تو نام تجویز ہونے شروع ہوئے اور بالآخر ''لاہور'' نام طے پایا۔ کہنے لگے! ''آپ کل ہی ''ڈیکلریشن'' کے لیے درخواست دے دیں۔''

جو دے دی گئی اور کوئی دو ماہ بعد ڈیکلریشن بھی مل گیا۔ لیکن اسی عرصہ میں مولانا ریڈیو پاکستان کی ملازمت اختیار کر کے کراچی چلے گئے۔ میں نے ڈیکلریشن مل جانے کی اطلاع کے ساتھ آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں استفسار کیا تو جواب ملا کہ ''اب آپ اسے نکالیں میری دعائیں آپ کے ساتھ رہیں گی۔''

اسی اثناء میں مجھے وکالت تبشیر میں تبادلے کا حکم نامہ مل گیا۔ مَیں ربوہ چلا گیا اور ''لاہور'' ڈمی چھپتا رہا جس پر ایڈیٹروں کی حیثیت سے تین نام ہوتے تھے۔ علامہ لطیف انور، عاطر ہاشمی اور ثاقب زیروی۔ اسی اثناء میں ایک ''ڈمی'' پر ایک ڈاکٹر سے متعلق ایک سخن گسترانہ بات ہوگئی ایک طنزیہ قطعہ کی صورت میں جس کا دوسرا شعر یوں تھا کہ

ایمان کو میراث سمجھنے والے
اخلاص تیرے باپ کی جاگیر نہیں

چونکہ اس قطعہ کا عنوان ''ڈاکٹر'' سے تھا۔ ایک ڈاکٹر صاحب جو اکثر و بیشتر ہماری معمولی معمولی باتوں کی بھی شکایتیں کرتے رہتے تھے اس قطعہ کی شانِ نزول اپنا وجود سمجھے اور روتے ہوئے پرچہ لے کر ''قصرِ خلافت'' میں پہنچ گئے۔ جواب ملا ''تم نے بھی تو کوئی کسر نہیں چھوڑی اب ایک لوہار کی بھی برداشت کرو۔''

یوں حضور کو پتہ چل گیا کہ میرے پاس ایک ڈیکلریشن ہے۔ چند روز بعد مجھے بلوایا اور فرمایا۔ ''معلوم ہوا ہے تمہارے پاس ایک ہفت نامے کا ڈیکلریشن ہے تو اسے نکالو۔''

عرض کیا ''وہ ڈیکلریشن لاہور ڈسٹرکٹ کا ہے پرچہ ربوہ سے نہیں لاہور ہی سے نکل سکتا ہے۔''

فرمایا ''ہاں ''لاہور'' ہی سے نکالو۔'' مَیں تمہیں ایک سال کی رخصت دیتا ہوں۔ بتاؤ پیسے کتنے چاہئیں۔''

عرض کیا ''صرف دعا چاہیے۔ پیسے نہیں۔ مَیں کوشش کروں گا کہ حضور کے ارشاد کی تعمیل احسن طور پر ہو سکے۔''

''لاہور'' میں جی پی او کے سامنے بینک سکوائر کی ایک عمارت میں اکثر نشست رہتی تھی ایک دن ایک شریکِ محفل چودھری شکراللہ خان ایڈووکیٹ (جن کی ''میڈیسنز'' کی ایک دوکان تھی) نے مجھ سے کہا کہ ''رسائل و جرائد میں تمہارے مضامین سے طبیعت بہت متاثر ہے تم اپنا پرچہ کیوں نہیں نکالتے؟''

مَیں نے بتایا کہ ''ایک ہفتہ وار کا ڈیکلریشن بھی میرے پاس ہے مگر صرف ڈیکلریشن کافی نہیں باقاعدہ پرچہ نکالنے کے لئے ''سرمایہ'' درکار ہے اور وہ میرے پاس نہیں۔''

کہنے لگے۔ ''اس کا ایک پورا پرچہ تو نکال کر دیکھو۔ مَیں آپ کو اس کے لیے دو صد روپے پیش کرتا ہوں میری ''میڈیکوز'' کا اشتہار اس میں لگا دینا۔''

اُن دنوں پانچ روپے فی رم نیوز پرنٹ تھا۔ مَیں نے 24 صفحے کا ایک پرچہ 20x30/4 شائع کیا جو چٹان، قندیل اور آفاق کے لگّے کا تھا۔ پہلا صفحہ یعنی سرورق بانی پاکستان کی شبیہ سے اور آخری صفحہ گورنر جنرل پاکستان کی تصویر سے مزیّن تھا۔ میرے تمام احباب پرچہ دیکھ کر اور پڑھ کر بہت محظوظ و متاثر ہوئے اور مَیں چالیس

پچاس کا پیاں لے کر بھائی جان چودھری عبداللہ خان کے پاس کراچی چلا گیا۔ پرچہ دیکھ کر کہنے لگا۔ ''ایسے ''لاہور'' کو تو باقاعدہ ہونا چاہیے۔ بتاؤ کتنے پیسے ہوں تو یہ باقاعدہ چھپنے لگے گا؟''

آل راؤنڈر تو مَیں تھا ہی پھر جوانی کا جوش، مَیں نے کہا۔ ''بھائی جان! اگر تین ہزار روپے جمع ہو جائیں تو میں اسے بند نہیں ہونے دوں گا۔''

کہنے لگے ''پروگرام کیا ہے؟''

عرض کیا کہ ''آج رات خواجہ ناظم الدین صاحب (گورنر جنرل) بالقابہ کے پاس گزاروں گا۔ کل آپ کے ہاں اور پرسوں واپسی۔''

مَیں گورنر جنرل ہاؤس چلا گیا۔ محترم خواجہ صاحب کی خدمت میں پرچہ پیش کیا۔ بہت خوش ہوئے اور ہنستے ہنستے اندر تشریف لے گئے اور پانچ دس منٹ کے بعد اسی طرح ہنسی بکھیرتے ہوئے واپس آئے اور فرمایا

''شاہ بانو (ہماری بیگم) ''لاہور'' کے اس پرچے سے بہت متاثر ہوئی ہیں اور انہوں نے کہا کہ ثاقب صاحب کی خدمت میں ہماری طرف سے نذرانے کے طور پر پانچ صد روپے پیش کیے جائیں۔ اور یہ لیجئے ان کے پانچ صد روپے'' (جنہیں مَیں نے شکریہ کے ساتھ وصول کیا) کچھ دیر تک مندرجہ مضامین پر تبصرہ فرماتے فرماتے ایک دم پھر ہنس پڑے اور فرمایا

''اور ہم تو شاہ بانو کے میاں ہیں ان سے دوگنا ہدیہ پیش کریں گے اور یہ لیجئے ایک ہزار روپے''

گویا نصف رقم مجھے اسی اقامت گاہ پر مل گئی۔ مَیں اگلے دن بھائی جان (چودھری عبداللہ خاں) سے ملا تو کہنے لگے۔ ''مَیں نے تیرا سو کے تین ڈرافٹ اشتہارات کے وصول کر لئے ہیں۔'' مَیں نے عرض کیا ''ڈیڑھ ہزار روپے میرے پاس خواجہ صاحب محترم اور ان کی بیگم کا عطیہ ہے۔''

یہ سُن کر اپنے اچکن اور کُرتے کی جیبیں کھنگالنے لگے اور تھوڑی دیر بعد کہا ''یہ لو دو سو روپے میری طرف سے۔ اب تین ہزار میں سے کچھ خرچ مت کرنا واپسی کا کرایہ اور سفر خرچ مَیں دوں گا۔'' اللہ تمہاری زبان مبارک کرے اور یہ کبھی بند نہ ہو''۔

(منقول تجربات جو ہیں امانت حیات کی)

❁❁❁

(راغب مرادآبادی)

مدح خوانِ سرور بطحا ہیں ثاقب زیروی
مستحقِ جنّت الماویٰ ہیں ثاقب زیروی

جانتے ہیں مُرسِل و مُرسَل کا فرق و امتیاز
نعت گو اس وصف یکتا ہیں ثاقب زیروی

نعت گوئی کی بحمد اللہ اِس انداز سے
محفلِ سرکارؐ میں گویا ہیں ثاقب زیروی

* سالک مرحوم بھی تھے ان کے اوصاف آشنا
اب نہ پُوچھے مجھ سے کوئی کیا ہیں ثاقب زیروی

دولتِ سرمد ہے یہ مجموعہ نعتِ رسولؐ
فیض یاب ربّی الاعلےٰ ہی ثاقب زیروی

شمع حُبِّ احمدؐ مرسل ہی دل میں ضوفگن
بے نیاز دولتِ دنیا ہیں ثاقب زیروی

جُملہ اصناف میں سُخن میں شعر گوئی کی مگر
نعت میں بھی مثل آپ اپنا ہیں ثاقب زیروی

ہے صحافت میں بھی حق گوئی و بے باکی پہ ناز
بندۂ حق گو مِرے مولا ہیں ثاقب زیروی

حرفِ حق کہنے سے باز آجائیں ممکن ہی نہیں
نرغہ اعداء میں گو تنہاء ہیں ثاقب زیروی

نعت گوئی ہی کا اے راغب یہ اِک اعجاز ہے
وارثِ فکرِ فلک پیما ہیں ثاقب زیروی

* (مولانا عبدالمجید خان سالک)

❁❁❁

بس اپنے حصے کی شمع جلانے کی ضرورت ہے۔

ایک طالب علم نے جب مصر کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ لیا، وقت ہونے پر اُس نے نماز پڑھنے کی جگہ تلاش کرنا چاہی تو اُسے بتایا گیا کہ یونیورسٹی میں نماز پڑھنے کی جگہ تو نہیں ہے۔ ہاں مگر تہہ خانے میں بنے ہوئے ایک کمرے میں اگر کوئی چاہے تو وہاں جا کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ طالبعلم یہ بات سوچتے ہوئے کہ دوسرے طالبعلم اور اساتذہ نماز پڑھتے بھی ہیں یا نہیں، تہہ خانے کی طرف اُس کمرے کی تلاش میں چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ نماز کیلئے کمرے کے وسط میں ایک پھٹی پرانی چٹائی تو بچھی ہوئی ہے مگر کمرہ صفائی سے محروم اور کاٹھ کباڑ اور گرد وغبار سے اٹا ہوا ہے۔ جبکہ یونیورسٹی کا ایک ادنیٰ ملازم وہاں پہلے سے نماز پڑھنے کیلئے موجود ہے۔ طالبعلم نے اُس ملازم سے پوچھا کیا تم یہاں نماز پڑھو گے؟

ملازم نے جواب دیا، ہاں، اوپر موجود لوگوں میں سے کوئی بھی ادھر نماز پڑھنے کیلئے نہیں آتا اور نماز کیلئے اس کے علاوہ کوئی جگہ بھی نہیں ہے۔ طالبعلم نے ملازم کی بات پر اعتراض کرتے ہوئے کہا؛ مگر میں یہاں ہرگز نماز نہیں پڑھوں گا اور اوپر کی طرف سب لوگوں کو واضح دکھائی دینے والی مناسب سی جگہ کی تلاش میں چل پڑا۔ اور پھر اُس نے ایک جگہ کا انتخاب کر کے نہایت ہی عجیب حرکت کر ڈالی۔ اُس نے بلند آواز سے اذان کہی! پہلے تو سب لوگ اس عجیب حرکت پر حیرت زدہ ہوئے پھر انہوں نے ہنسنا اور قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ اُنگلیاں اُٹھا کر اس طالبعلم کو پاگل اور اُجڈ شمار کرنے لگے۔ مگر یہ طالبعلم تھا کہ کسی چیز کی پرواہ کیے بغیر اذان پوری کہہ کر تھوڑی دیر کیلئے اُدھر ہی بیٹھ گیا۔ اُس کے بعد دوبارہ اُٹھ کر اقامت کہی اور اکیلے ہی نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اُسکی نماز میں محویت سے تو ایسا دکھائی دیتا تھا کہ گویا وہ اس دنیا میں تنہا ہی ہے اور اُسکے آس پاس کوئی بھی موجود نہیں۔ دوسرے دن پھر اُسی وقت پر آ کر اُس نے وہاں پھر بلند آواز سے اذان دی، خود ہی اقامت کہی اور خود ہی نماز پڑھ کر اپنی راہ لی۔ اور اس کے بعد تو یہ معمول ہی چل نکلا۔ ایک دن، دو دن، تین دن۔۔۔ وہی صورتحال۔۔۔ پھر قہقہے لگانے والے لوگوں کیلئے اُس طالبعلم کا یہ دیوانہ پن کوئی نئی چیز نہ رہی اور آہستہ آہستہ قہقہوں کی آواز بھی کم سے کم ہوتی گئی۔ اسکے بعد پہلی تبدیلی کی ابتداء ہوئی۔ نیچے تہہ خانے میں نماز پڑھنے والے ملازم نے ہمت کر کے باہر اس جگہ پر اس طالبعلم کی اقتداء میں نماز پڑھ ڈالی۔ ایک ہفتے کے بعد یہاں نماز پڑھنے والے چار لوگ ہو چکے تھے۔ اگلے ہفتے ایک اُستاذ بھی آ کر اِن لوگوں میں شامل ہو گیا۔ یہ بات پھیلتے پھیلتے یونیورسٹی کے چاروں کونوں میں پہنچ گئی۔ پھر ایک دن چانسلر نے اس طالبعلم کو اپنے دفتر میں بلا لیا اور کہا: تمہاری یہ حرکت یونیورسٹی کے معیار سے میل نہیں کھاتی اور نہ ہی یہ کوئی مہذب منظر دکھائی دیتا ہے کہ تم یونیورسٹی ہال کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر اذانیں دو یا جماعت کراؤ۔ ہاں میں یہ کر سکتا ہوں کہ یہاں اس یونیورسٹی میں ایک کمرے کی چھوٹی سی صاف سُتھری مسجد بنوا دیتا ہوں، جس کا دل چاہے نماز کے وقت وہاں جا کر نماز پڑھ لیا کرے۔

اور اس طرح مصر کی ایگریکلچر یونیورسٹی میں پہلی مسجد کی بنیاد پڑی۔ اور یہ سلسلہ یہاں پر رُکا نہیں، باقی کی یونیورسٹیوں کے طلباء کی بھی غیرت ایمانی جاگ اُٹھی اور ایگریکلچر یونیورسٹی کی مسجد کو بُنیاد بنا کر سب نے اپنے اپنے ہاں مسجدوں کی تعمیر کا مطالبہ کر ڈالا اور پھر ہر یونیورسٹی میں ایک مسجد بن گئی۔ اِس طالبعلم نے ایک مثبت مقصد کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور پھر اِس مثبت مقصد کے نتائج بھی بہت عظیم الشان نکلے۔ اور آج کے دن تک، خواہ یہ طالبعلم زندہ ہے یا فوت ہو چکا ہے، مصر کی یونیورسٹیوں میں بنی ہوئی سب مسجدوں میں اللہ کی بندگی ادا کیے جانے کے عوض اجر وثواب پا رہا ہے اور رہتی دُنیا تک اسی طرح اجر پاتا رہے گا۔ اس طالب علم نے اپنی زندگی میں کار خیر کر کے نیک اعمالوں میں اضافہ کیا۔

میرا آپ سے یہ سوال ہے کہ

ہم نے اپنی زندگیوں میں ایسا کونسا اضافہ کیا ہے؟ تا کہ ہمارا اثر ورسوخ ہمارے گردو نواح کے ماحول پر نظر آئے، ہمیں چاہیئے کہ اپنے اطراف میں نظر آنے والی غلطیوں کی اصلاح کرتے رہا کریں۔ حق وصدق کہنے اور کرنے میں کیسی مروت اور کیسا شرمانا؟ بس مقاصد میں کامیابی کیلئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد ونصرت کی دعا مانگتے رہیں۔

اور اسکا فائدہ کیا ہوگا؟

اپنے لیئے اور دوسرے کیلئے سچائی اور حق کا علم بُلند کر کے اللہ کے ہاں مأجور ہوں کیونکہ جس نے کسی نیکی کی ابتداء کی اُس کیلئے اجر، اور جس نے رہتی دُنیا تک اُس نیکی پر عمل کیا اُس کیلئے اور نیکی شروع کرنے والے کو بھی ویسا ہی اجر ملتا رہے گا۔ لوگوں میں نیکی کرنے کی لگن کی کمی نہیں ہے بس اُن کے اندر احساس جگانے کی ضرورت ہے.....

(بشکریہ امۃ الباری ناصر امریکہ)

معلم کا رویہ

تحریر: غلام شبیر

طالب علم کی سکول یا تعلیم سے وابستگی، عدم وابستگی کے پیچھے خاندانی پسِ منظر، اس کے ہم جولیوں کے ساتھ ٹیچر کا ہاتھ شامل ہے۔ اگر گھر میں والدین ذمے دار ہیں تو سکول میں ٹیچر اس کی پڑھائی میں دل چسپی کا ذمے دار ہے۔ اگر چہ بہت سے طالب علم ذاتی طور پر تعلیم میں دل چسپی نہیں لیتے، لیکن اس کے ساتھ ٹیچر کا رویہ بھی تعلیم میں عدم دل چسپی کی وجہ ہوسکتا ہے۔ جہاں استاد کا نرم رویہ طالب علم کو تعلم میں شامل رکھتا ہے وہیں استاد کے رویے میں دُرشتی کلاس میں طلَباء کے تعلّم پر نہ صرف برا اثر ڈالتی ہے، بَل کہ طلَباء میں شرمندگی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اگر استاد طالب علم کی کوشش پر تعریف ہی کردے یا اس کی ہمت باندھے تو اس میں نہ صرف کام کی لگن پیدا ہوتی ہے بل کہ وہ ٹیچر کو آئیڈیلائز کرنے لگتا ہے۔ لرننگ کا اس وقت دیر پا اثر ہوتا ہے جب داخلی رغبت کا سہارا ہو نہ کہ کسی وقتی بیرونی تقویت کا دباؤ۔

جیسے کہانی، ناول داخلی رغبت میں مدد و معاون ہیں اسی طرح طلباء کو ان کے سوالات بارے ٹھوس مدلل انداز میں جواب دینا ان کو اپنے جوابات تلاش کرنے میں مدد دیتا ہے جس سے لرننگ کا عمل آگے بڑھتا ہے۔ ٹیچر کا طالب علم سے رویہ دوطرفہ ردعمل لے کر آتا ہے اگر ٹیچر طلباء سے ربط میں جڑ جاتا ہے تو نہ صرف با اعتماد طلباء بل کہ ڈرے سہمے طلباء بھی اپنا پوٹینشل تلاش کر لیتے ہیں؛ بہ صورتِ دیگر طالب علم نفسیاتی گھٹن کا شکار ہو کر ادھوری شخصیت لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ طالب علم والدین کی اتنی نہیں مانتے جتنی کہ استاد کی۔ ایک استاد اگر قول کا پکا نہیں ہوگا تو طلباء ایسے ٹیچر پہ اعتبار نہیں کرتے: مثال کے طور اگر ایک استاد طلباء کو ہوم ورک دیتا ہے پر چیک نہیں کرتا تو طلباء یہ یقین کر لیتے ہیں کہ ٹیچر ایسے کہتے ہیں کہ میں چیک کروں گا پر کرتے نہیں، تو طلباء سوشل لائف میں یہی مائنڈ سیٹ لے کر چلیں گے کہ ٹرخا ٹرخا کر وقت پاس کیا جائے۔ جو ٹیچر بار بار کہے کہ کام مکمل کرو ورنہ مرغا بنا کر ماروں گا یا سٹک سے سزا دوں گا یا خوف ناک بن کر کہے کہ پنکھے سے الٹا لٹکا دوں گا تو طلباء بوکھلاہٹ میں آکر جو بھی کوششیں کریں گے وہ بے ربط ہو کے کریں گے، دل جمعی کے ساتھ نہیں کریں گے۔

طلباء کی ضروریات، دل چسپیوں کے پیشِ نظر ان کی انفرادیت کا احساس ٹیچر کو ہونا ضروری ہے، کیوں کہ ہر طالب علم ایک علیحدہ خاندانی پسِ منظر، سماجی حالات، اور نفسیاتی امتیاز کا آئینہ دار ہے تمام طلباء کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے رہنا دانش مندی نہیں۔

استاد کے طالب علم کی تحصیلِ علم میں کہے گئے جملے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اگر استاد صرف یہ کہہ دے کہ مجھے یقین ہے کہ تم اسے اچھا کر سکتے ہو یا اس سے اچھا کر سکتے ہو تو طالب علم میں اس بھروسے کے نتیجے میں جو تحریک پیدا ہوتی ہے وہ اس کی ایسی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا باعث ہوسکتی ہے۔ اب اگر استاد کام کے مکمل نہ ہونے پر طالب علموں پر چیخنا چلانا شروع کردے تو طلباء عدم تحفظ کا شکار رہتے ہیں۔

استاد کو ایجنٹ بھی کہا جاتا ہے جو کلاس میں چل پھر کر طلباء کو پیش آنے والے مسائل کا جائزہ لیتا ہے اور سیکھنے کے عمل میں بننے والی رکاوٹوں کو سمجھتا ہے اور اس بارے اپنا کردار ادا کرتا ہے؛ اب اگر استاد کرسی پر بیٹھا حکم صادر کردے کہ یہ کردو وہ کردو تو ایسا آدمی استاد کم ڈکٹیٹر زیادہ ہوتا ہے۔ طلباء ایسے تعلّم کا بھرپور جواب دیتے ہیں جو ان کی موجودہ صورتِ حال سے مطابقت رکھتا ہو۔ اگر استاد روایتی گھسے پٹے طریقۂ تدریس کو اپنائے اور کسی قسم کے امدادی اوبجیکٹس یا میٹریل کو خاطر میں نہ لائے تو ایسا تعلّم شارٹ ٹرم، لانگ ٹرم اسائنمنٹ کو تو حاصل کرنے میں مددگار ہوسکتا ہے، پر ان میں تخلیقی وتنقیدی صلاحیتوں کو زنگ آلود ضرور کردے گا۔

❁❁❁

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لیے مختصر دورانیئے کی ڈاکومینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکومینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی،.....ہو۔ ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ..... اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

ایس۔اے۔صہبائی

ایس۔اے۔صہبائی پاکستان کی ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت جو اپنی ہستی میں ایک ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔صہبان عارف صہبائی کہیں ہمیں روحانیت کے درخشندہ ستاروں میں مخدوم سبحان کی حیثیت میں نظر آتے ہیں تو کہیں صحافتی دنیا کے افق میں قائد صحافت سے لیکر میڈیا انڈسٹری کے قابل احترام استاد، صحافی، دانشور، کالم نگار، ادیب شاعر، اینکر پرسن، سوشل ورکر، موٹیویشنل اسپیکر اور ہیومن رائٹس ایکٹویسٹ کی حیثیت سے گولڈ میڈلسٹ اور بے شمار ایوارڈز اور تنظیموں کے بانی چیئرمین صدر اور مینیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے زبان زد عام ایس۔اے۔صہبائی کے نام سے دنیا بھر میں اپنی منفرد پہچان کی ملٹی ٹیلینٹڈ شخصیت کا نام ہے۔صہبان عارف صہبائی کا نام عالم روحانیت کی معروف ہستی بانی سلسلہ توحیدیہ نقشبندیہ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاری نے رکھا۔ صہبان عارف صہبائی یکم ستمبر 1971 پشاور ائیر فورس ہاسپٹل میں رات 2 بجے ائیر فورس کے منجھے ہوئے ریڈار مکینک کاپل ٹیک الحاج احمد خان سبحان کی زوجہ بیگم نسیم اختر کے بطن سے دنیا میں تشریف لائے گویا آسمانی پرواز کے تخیلاتی اڑن کھٹولے پر ایس۔ اے۔صہبائی بچپن سے ہی محو پرواز رہے۔آپ نے ابتدائی تعلیم ضلع اٹک کی تحصیل پنڈی گھیب سے حاصل کی جبکہ گریجوایشن پنجاب یونیورسٹی سے اور ایم۔بی اے ہیومن ریسورس میں یونیورسٹی آف ویژول سائنسز UVS امریکہ سے حاصل کی۔ایس۔ اے۔صہبائی نے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز روزنامہ وطن سے رپورٹر کی حیثیت سے شروع کیا بعدازاں پاکستان کے تمام معروف صحافتی اداروں میں نیوز ایڈیٹر سے لے کر ایڈیٹوریل انچارج ایڈیٹر اور ایڈیٹر انچیف کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ پاکستان کی نامور صحافتی شخصیات بالخصوص مجید نظامی، مجیب الرحمن شامی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر شاہد مسعود، مبشر لقمان، ضمیر جعفری اور بہت سے پاکستان کے منجھے ہوئے صحافیوں ادیبوں شعراء اور سماجی شخصیات کے ساتھ خدمات سرانجام دیتے رہے اور صحافت ادب اور سماجی خدمات کے اعتراف میں گولڈ میڈلز لیجنڈ ایوارڈ پلرز آف پاکستان، سلام پاکستان ایوارڈز اور سوونیئرز وصول کر چکے ہیں۔

ایس۔اے۔صہبائی بانی / چیئرمین جرنلسٹس ایسوسی ایشن آف پاکستان، ورلڈ اسلامک میڈیا اور انٹرنیشنل پریس کونسل فار پیس لو اور متعدد ادبی، سماجی اور صحافتی تنظیموں کے بانی اور مینیجنگ ڈائریکٹر رہے اور متعدد ممالک میں یو این ہیومن رائٹس ایمبیسڈرز کی حیثیت سے War against Terrorism کے لیے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ایس۔اے۔صہبائی اپنی شہرہ آفاق کتاب عشق سمندر میں جہاں اپنی روحانی پرواز کا تذکرہ کرتے ہوئے عرش الٰہی کی سیر کرتے ہیں وہیں مسجد نبوی ﷺ میں

رسالتماب حضور اکرم ﷺ کے دربار میں دیدار مصطفی ﷺ کا شرف حاصل کرتے ہیں وہیں دنیائے اسلام اور عالم روحانیت کی جلیل القدر بزرگ ہستیوں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے لیکر حضرت پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے روحانی ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہیں وہیں دوسری جانب اپنی دوسری کتاب دھرتی کا خادم بن کر پاکستانی افواج اور ہیروز آف پاکستان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے پاکستان کے نامور شعراء کے پاک سرزمین پر مشتمل سحر انگیز کلام کو دھرتی کا خادم کے نام پر مشتمل اپنی کتاب میں لڑی کی حیثیت سے پرو دیتے ہیں وہیں عالمی تناظر میں دنیا کو ماحولیاتی آلودگی سمیت دہشتگردی کے عذاب سے بچانے کے لیے میرا گھر میری جنت کتاب لکھ ڈالتے ہیں جس پر انہیں یونائیٹڈ نیشن کے ایمبیسڈر کی حیثیت سے دنیا کی سیاحت بالخصوص سینٹرل افریقہ میں کافی وقت گزارنے کا موقع ملا۔دنیائے عالم بالخصوص یورپی ممالک کی پٹرولیم میں دلچسپی صہبان عارف کو آئل فیلڈ کی دنیا میں لے گئی اور یوں ایس۔اے۔صہبائی نے پاکستان سے سوڈان کا سفر کیا اور زندگی کے سبھی شعبوں کے نام نہاد کرپٹ ڈان مافیا سے نمٹنے کے لیے اپنا سفرنامہ سوڈان سے ڈان تک لکھ ڈالا مگر اپنی طبعی شرافت نزاکت اور کائناتی حسن و جمال کے باعث ڈان کی دنیا سے نکل کر گیت میرے من کے لکھ ڈالی اور شوبز کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔

آج ایس۔اے۔صہبائی کا نام پاکستان کی معروف روحانی ادبی صحافتی سماجی اور ثقافتی شخصیات میں ہوتا ہے جو کہ صحافت میں ولایت اور شیوہ پیغمبری اور نیشن بلڈنگ کے قائل ہیں بقول ایس۔اے۔صہبائی مثبت میڈیا قوموں کی تقدیر بدل سکتا ہے بالخصوص پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے کرپٹ مافیا کے خلاف علم جہاد بلند کرتے ہوئے میڈیا پر لگے بلیک میلنگ کے بدنما داغ کو پاکستانی میڈیا کے ماتھے سے ختم کر کے پاکستان کے مثبت تشخص کو عالمی سطح پر اجاگر کرنا ہے۔

(تاریخ کے جھروکوں سے)

ظفر اللہ خان کاش سب لوگ تمہاری طرح ہوں

تحریر: محی الدین عباسی

چودھری ظفر اللہ خان کو پنجاب کونسل کے انتخاب اور کامیابی کے دوران جو حالات پیش آئے آپ نے اپنی کتاب تحدیثِ نعمت میں بیان کیا ہے علاوہ ازیں اس کامیابی کے بعد آپ کی سیاسی قدوقامت میں بیش بہا اضافہ ہوتا چلا گیا اور آپ ایک عالمی سطح کے لیڈر کے طور پر تاریخ کا حصہ بن گئے۔ بقول چودھری جہان خان صاحب ''ظفر اللہ خان کاش سب لوگ تمہاری طرح ہوں'' اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پنجاب کونسل کے انتخاب میں حصہ لینے کی تیاری: 1926ء کے اگست میں والد صاحب ڈسکہ میں تشریف فرما تھے کہ ان کی طبیعت پھر ناساز ہوگئی۔ اس سال بھی مجالسِ قانون ساز کے انتخابات ہونے والے تھے۔ 1923ء کے انتخابات میں چودھری سر شہاب الدین صاحب ضلع سیالکوٹ کے حلقے سے چودھری جہان خاں صاحب گورایہ کے مقابلے میں پنجاب کونسل کے رکن منتخب ہوئے تھے اور بعد میں کونسل کی صدارت پر فائز ہوئے تھے۔ 1926ء میں ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ ضلع سیالکوٹ سے بھی امیدوار ہوں اور ضلع گورداسپور سے بھی۔ اور دونوں حلقوں میں کامیاب ہو جانے کی صورت میں ایک نشست خالی کر دیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے پھر امام جماعت احمدیہ کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا جس میں علاوہ دیگر امور کے یہ بھی ذکر کیا کہ ظفر اللہ خاں کو کچھ نہ کچھ فائدہ مجھ سے پہنچتا رہتا ہے۔ حضرت صاحب نے خاکسار کو قادیان طلب فرمایا۔ حاضرِ خدمت ہونے پر چودھری صاحب کا عریضہ پڑھنے کے لئے دیا اور دریافت فرمایا کہ اگر چودھری صاحب تم سے رنجیدہ خاطر ہوں تو تم کس قدر مالی فائدے سے محروم ہو جاؤ گے خاکسار نے عرض کیا کہ انڈین کیسیز کے دفتر سے جو کام بھیجا جاتا ہے اس سے چند سو روپے ماہوار کی آمد ہو جاتی ہے۔ لیکن رزق تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ چودھری صاحب ہمیشہ خاکسار کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے رہے ہیں اس لئے خاکسار ان کا ممنون ہے اور ان کا احترام کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے خاکسار ان کا کسی رنگ میں محتاج نہیں۔ حضرت صاحب نے فرمایا۔ چودھری صاحب نے 1923ء میں پختہ وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ ضلع سیالکوٹ سے انتخاب کے لئے امیدوار نہیں ہوں گے۔ اس الیکشن میں ان کا ارادہ ضلع گورداسپور سے امیدوار ہونے کا بھی ہے۔ اس حلقے میں ہم ان کی ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہیں اور ممکن ہے یہاں سے وہ بلا مقابلہ ہی منتخب ہو جائیں۔ لیکن ضلع سیالکوٹ کے متعلق انہیں اپنے عہد پر قائم رہنا چاہیئے۔ فرمایا کہ انہیں یہ جواب لکھنے سے پہلے میں چاہتا تھا کہ تم سے بھی دریافت کرلوں۔ لاہور واپس آنے کے بعد جب انڈین کیسز کے دفتر سے مجھے کچھ کام بھیجا گیا تو میں نے واپس کر دیا اور کہہ دیا کہ آئندہ مجھے کام نہ بھیجا کریں۔

دوسرے دن چودھری جہان خان صاحب میرے مکان پر تشریف لائے اور دریافت فرمایا ظفر اللہ خان کیا وجہ ہوئی تم نے انڈین کیسیز کے کام کے متعلق کہلا بھیجا ہے کہ آئندہ تمہیں نہ بھیجا جائے۔ میں نے عرض کیا میں آپ کے ساتھ کار میں بیٹھ جاتا ہوں آپ ڈرائیور کو ارشاد فرمائیں کہ کار نہر کے کنارے کنارے لے چلے وہاں میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ کے سوال کا جواب عرض کردوں گا لیکن اگر آپ نے کچھ فرمانا ہو تو میرا جواب سُن لینے کے بعد فرمائیں۔ مسکرا کر فرمایا بہت اچھا۔ میں نے ان کے اس خط کا ذکر کیا جو انہوں نے حضرت صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور کہا کہ اس میں آپ نے فرمایا کہ مجھے آپ سے فائدہ پہنچتا رہتا ہے اس بات سے مجھے کوئی رنج تو نہیں ہوا کیونکہ جو کچھ آپ نے لکھا وہ امرِ واقعہ ہے لیکن آپ کے اس فقرے نے میرے ذہن میں خیالات کی ایک رُو جاری کر دی۔ انسان کا اندازہ اپنی ذات کے متعلق صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ میرا اندازہ اپنے متعلق یہ ہے کہ میں حتی الوسع حفظِ مراتب کا خیال رکھتا ہوں اور جس شخص کو اللہ نے جس مقام پر کھڑا کیا ہو اس کے کچھ واجبات مجھ پر عاید ہوتے ہیں انہیں مناسب طور پر ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مثلاً سر شادی لال چیف جسٹس ہیں۔ بہت سے امور میں مجھے ان کے طرز و طریق سے اختلاف ہے۔ ان کی بعض کمزوریاں تو آشکار ہیں۔ میں ان کی عدالت میں پریکٹس کرتا ہوں۔ سال میں اوسطاً ایک مرتبہ میں چند منٹوں کے لئے ان میں خدمت میں حاضر ہوآتا ہوں۔ ممکن ہے ان کو اس سے حیرت بھی ہوتی ہو کہ میں نہ ان کی خوشامد کرتا ہوں نہ کوئی غرض پیش

کرتا ہوں۔لیکن میں کسی خوف یا طمع کی وجہ سے ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا۔ میرے دل میں کسی انسان کا خوف ہے نہ کسی سے کوئی طمع ہے۔آپ میرے بچپن سے میرے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہے ہیں۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں اور آپ کا ممنون ہوں۔آپ نے مجھے آپ سے فائدہ پہنچنے سے متعلق جو کچھ لکھا اس سے مجھے خیال پیدا ہوا کہ میں خود اپنا امتحان کرلوں کہ کیا جیسے میں سمجھتا ہوں میرے دل میں آپ کا احترام آپ کے گذشتہ حسنِ سلوک کی وجہ سے اور والد صاحب کے دوست ہونے کی وجہ سے ہے۔کہیں ایسا تو نہیں کہ جسے میں احترام سمجھتا ہوں اس کی حقیقت آئندہ کے طمع کی خاطر خوشامد کی ہے۔میں نے ایڈین کیسیز کا کام اس لئے بند کردیا ہے کہ جلبِ منفعت کا پہلو ہمارے تعلقات سے خارج ہوجائے۔اگر آئندہ بھی میرے جذبات آپ کے متعلق وہی رہیں جو اب تک ہیں تو میں سمجھ لوں گا کہ میرا اندازہ اپنے متعلق صحیح تھا۔اور اگر ان میں فرق آگیا تو میں سمجھوں گا میرا نفس مجھے فریب دیتا ہے۔ چودھری صاحب نے میری بات خاموشی سے سنی اور جب میں ختم کرچکا تو صرف اتنا فرمایا

''ظفر اللہ خاں کاش سب لوگ تمہاری طرح ہوں۔''

جب 1926ء کے انتخابات کا سلسلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ میرا مقابلہ چودھری جہاں خانصاحب گورایہ کے ساتھ ہوگا۔ چودھری صاحب ضلع سیالکوٹ کے ایک خوش خلق، مہمان نواز، بارسوخ زمیندار تھے۔ڈسٹرکٹ بورڈ کے رُکن ہونے کی وجہ سے ضلع بھر کے سرکردہ زمینداروں کے ساتھ ان کا متواتر میل جول اور باہم مشورہ رہتا تھا۔ان کے رشتہ داری اور برادری کے تعلقات بھی بہت وسیع تھے۔1923ء میں چودھری سر شہاب الدین صاحب کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے انہیں انتخاب کے سلسلہ میں معتدبہ اخراجات برداشت کرنے پڑے تھے اس لئے انہیں یہ احساس ضرور ہوگا کہ انتخاب میں امیدوار کو بہت کچھ گرم سرد حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔میرا اندازہ ہے کہ ان کی طبیعت اس طرف مائل تھی کہ اگر آپس میں سمجھوتے کے ساتھ کسی فیصلے کی صورت پیدا ہوجائے تو یہ طریق مناسب ہوگا۔ اس انتخاب میں اگرچہ امیدوار تو میں تھا لیکن چودھری جہان خاں صاحب جانتے تھے کہ میری تائید جس قدر ہوگی وہ میرے والد صاحب کے تعلقات اور رسوخ کی وجہ سے ہوگی۔ضلع سیالکوٹ کے نارووال کے علاقے میں چودھری فتح الدین صاحب ذیلدار مدّو کاہلوں ایک بارسوخ اور باتدبیر زمیندار تھے۔انہوں نے کسی ملاقات کے دوران میں چودھری جہان خانصاحب سے کہا کہ انتخاب کی سردردی کی بجائے کیوں نہ کوئی صورت سمجھوتے کی اختیار کرلی جائے۔ چودھری صاحب نے فرمایا اگر آپ کے ذہن میں کوئی صورت ہو تو فرمائیں۔ چودھری فتح الدین صاحب نے کہا قرعہ اندازی سے فیصلہ کرلیا جائے۔ چودھری جہان خانصاحب نے فرمایا مناسب ہے۔لیکن قرعہ اندازی ڈپٹی کمشنر صاحب کریں۔ چودھری فتح الدین صاحب نے جواب میں کہا کہ اس میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔۔اس کے بعد چودھری فتح الدین صاحب نے والد صاحب سے کہا۔ میں نے چودھری جہان خانصاحب کو قرعہ اندازی پر رضامند کرلیا ہے آپ بھی رضامندی دیدیں والد صاحب فرمایا مجھے تو یہ طریق پسندیدہ معلوم نہیں ہوتا۔لیکن چونکہ آپ چودھری جہان خاں صاحب کو اس طریق پر آمادہ کرچکے ہیں اور میرے انکار کردینے سے آپ کی سبکی ہوگی اس لئے میں بھی رضامندی دے دیتا ہوں۔ چنانچہ والد صاحب نے خاکسار کو ارشاد فرمایا کہ چودھری جہان خاں صاحب کے ساتھ ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس جاکر قرعہ اندازی کرلو۔ میں نے جب مسٹر ہرن ڈپٹی کمشنر کے ساتھ ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ہم دونوں کو اپنے بنگلے پر بُلوایا دو دیا سلائی کی ڈبیہ خالی کرکے ایک میں میرے نام کا پُرزہ ڈال دیا اور دوسری میں چودھری جہان خاں صاحب کے نام کا۔ اپنے جمعدار اردلی سے کہا ان میں سے ایک اٹھالو اور اس میں جو پرزو ہے وہ نکالو جو پرزہ جمعدار نے نکالا اس پر میرا نام تھا لہٰذا چودھری جہان خاں صاحب انتخاب سے دستکش ہوگئے۔

اس کے تھوڑا عرصہ بعد والد صاحب کی طبیعت ناساز ہوگئی حرارت کے ساتھ کھانسی رہنے لگی۔ والدہ صاحبہ کے اطلاع دینے پر میں ڈسکے گیا اور والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو لاہور لے آیا ڈاکٹر محمد یوسف صاحب نے معائنہ کیا اور WET PLURESY تشخیص کیا۔ بہت توجہ سے علاج کرتے رہے فجزاھا اللہ احسن الجزاء۔ کچھ دن بعد پھیپھڑے سے پانی نکالا جس سے بفضل اللہ کچھ افاقہ ہوا لیکن پھر تکلیف بڑھنا شروع ہوگئی۔اس مرحلے پر ڈاکٹر محمد یوسف صاحب کو بعض فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں شملے کا سفر پیش آگیا۔ان کی غیر حاضری میں ڈاکٹر یار محمد خانصاب علاج کرتے رہے۔ دو تین دن بعد پھر پانی نکالنے کی تجویز ہوئی۔لیکن اب کی بار بجائے افاقے کے کمزوری بڑھنا شروع ہوگئی۔ 31/اگست منگل وار کی صبح کو بعد نمازِ فجر والدہ صاحبہ نے مجھے اپنا ایک خواب سنایا خواب کی تعبیر واضح تھی اور والدہ صاحبہ نے بھی یہی تعبیر بتائی کہ تمہارے والد جمعہ کا دن شروع ہوتے ہی فوت ہوجائیں گے۔ انہوں نے فرمایا کہ ابھی سے سب تیاری کرلی جائے۔ چنانچہ تفصیلی ہدایات دیں جن کی تعمیل کردی گئی۔ یہ دن ہم سب کے لئے سبق آموز بھی تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و رحم کے نشانات کے ظاہر کرنے والے بھی تھے۔دل درد سے پُر بھی تھا اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر کلیتہً راضی بھی تھا۔کچھ تفصیل ان ایام کی میری کتاب ''میری والدہ'' میں بیان کی گئی ہے۔ یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور مجھے ہمت بھی نہیں پڑتی۔ والدہ صاحبہ کے خواب کے مطابق 2 ستمبر 1926ء بعد نمازِ مغرب جب اسلامی شمار سے جمعہ کا دن شروع ہی ہوا تھا ہم اس سراپا شفقت بزرگ ہستی کی ہدایت اور رفاقت سے محروم ہوگئے یغفر اللہ لہ ویجعل الجنۃ العلیا مثواہ۔ والدہ صاحبہ کی ہدایات کے مطابق سب انتظام ہوچکا تھا دو بجے شب ہم ان کے جنازے کو لے کر روانہ ہوئے طلوعِ آفتاب کے وقت

قادیان پہنچے۔اسی رات حضرت صاحب باوجود رستے کی خرابی کے ڈلہوزی سے قادیان تشریف لائے۔ 4 ستمبر 9 بجے صبح اپنے ناظر اعلیٰ کا جنازہ پڑھایا اور سلسلہ کے پہلے ناظر اعلیٰ مقبرہ بہشتی میں خاص صحابہ کے قطعہ میں دفن ہوئے۔

پنجاب کونسل کے انتخاب میں کامیابی: والد صاحب کی وفات کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ چودھری اکبر علی خاں صاحب سکنہ کوٹلی نوناں تحصیل ڈسکہ انتخاب میں امیدوار ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پہلے تو میں نے اس اطلاع کو باور نہ کیا۔ چودھری صاحب کے میرے ساتھ خاندانی اور ذاتی بہت دوستانہ تعلقات تھے اور وہ میرے معاونین میں سے تھے بیشک ان کی طبیعت مزاح کی طرف مائل تھی لیکن یہ معاملہ سنجیدہ تھا اور بہرصورت انہیں کامیابی کی کوئی امید نہیں ہوسکتی تھی۔ معلوم ہوا کہ ان کا موقف یہ ہے کہ قرعہ اندازی سے فیصلہ کرنا کہ کون امیدوار ہو درست نہیں اور رائے دہندگان کو اپنی رائے کے اظہار کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ انہیں کامیابی کی توقع نہیں وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ میرا انتخاب ہی مناسب ہوگا لیکن قرعہ اندازی کے طریق کو پسند نہ کرتے تھے۔ اصولاً تو ان کا مؤقف درست تھا اور جب وہ انتخاب میں حصہ لینے پر مصر تھے تو انہیں باز رکھنے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ وقت آنے پر انہوں نے درخواست دیدی۔ اس لئے انتخاب کی کارروائی لازم ہوگئی اور ہمیں انتخاب کا بکھیڑا جھیلنا پڑا۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ضلع سیالکوٹ کے سرکردہ زمیندار اصحاب کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات مضبوط ہوگئے۔ انتخاب کی بھاگ دوڑ کے سلسلہ میں ایک لطیفے کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ماجرہ کلاں کے ''سفید پوش'' چودھری جہان خاں صاحب نے خواہش کی کہ میں ان کے ہمراہ ان کے گاؤں جا کر وہاں کے رائے دہندگان سے ملوں۔ چنانچہ ایک شام میں اور چودھری قاسم علی خاں صاحب ذیلدار ان کے ہمراہ ان کے گاؤں گئے اور رات ان کے ہاں مہمان رہے۔ دوسری صبح انہوں نے دیہہ کے مالکان کو اپنے دیوان خانے میں بلا لیا اور میرا ان سے تعارف کرایا اور میرے آنے کی غرض بیان کی اتنے میں ناشتہ آ گیا۔ میزبان نے فرمایا تمہارا وقت قیمتی ہے ناشتہ کرلیں گفتگو جاری رہے گی ناشتہ ختم ہوا تو مالکان دیہہ میں سے ایک نے مسکراتے ہوئے حاضرین سے کہا ''بھائیو میں تو کہتا ہوں پرچی (ووٹ) اسی چودھری کو دینی چاہیئے''۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ رائے تو ہماری بھی یہی ہے لیکن تمہارے مشورے کی کوئی خاص وجہ ہے اس نے کہا ''وجہ یہ ہے کہ ہم سب زمیندار ہیں اور جب ہمیں بیل خریدنا ہوتا ہے تو علاوہ اور باتوں کے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بیل چرنے (کھانے) میں کیسا ہے جو بیل اچھی طرح چرتا ہے وہ کلبہ رانی بھی خوب کرتا ہے۔ میں اس چودھری کو کھاتے دیکھتا رہا ہوں یہ چرتا خوب ہے چلے گا بھی خوب''۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور ہنستے ہنستے محفل برخاست ہوئی۔ چودھری اکبر علی صاحب صرف اتنا دعا کرتے تھے کہ ان کی ضمانت ضبط نہیں ہوگی۔ انتخاب کا نتیجہ نکلا تو اس کے برعکس ان کی تائید میں آراء کی اس قدر کمی رہی کہ ان کا زرِ ضمانت ضبط ہوگیا۔ (تحدیثِ نعمت صفحہ 227 تا 231)

علاوہ ازیں اس کامیابی کے بعد آپ نے برصغیر ہند و پاک اور عالمی سطح پر جو خدمات سرانجام دیں ان کا احاطہ کرنا ناممکن ہے لیکن مختصراً ذکر کر دیتا ہوں۔ تحدیثِ نعمت میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ قائداعظم نے 1929ء دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں نہرو رپورٹ کے جواب میں 14 نکات پیش کئے جو کہ تحریکِ پاکستان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اس میں ایک علیحدہ مملکت ریاست کا ذکر قابلِ ستائش ہے۔ جو بعد میں 23 مارچ 1940ء میں قراردادِ پاکستان لاہور میں پیش کی گئی تھی۔ اور 2 مارچ کو مسلم لیگ کے اجلاس میں یہ پاس کی گئی تھی۔ آپ نے اسلامی ممالک کی آزادی کے لیے اقوامِ متحدہ میں بھرپور آواز اٹھائی اور ان کو آزادی دلوائی۔ کشمیر کے حوالے سے قضیہ کشمیر کا اقوامِ متحدہ کی مجلسِ امن میں بھرپور کیس لڑا اور ان کے حق میں ایک قرارداد پاس کروائی۔ آج بھی پاکستانی حکومت اسی حوالے سے ہر سال اقوام متحدہ کے اجلاس میں اس کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ آپ 1948ء سے 1956ء تک جنرل اسمبلی کے سالانہ اجلاس میں بطور نمائندہ پاکستان پیش ہوتے رہے۔ 1962ء میں اقوام متحدہ کے 17 ویں سالانہ اجلاس کی صدارت کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ اس کے علاوہ اقوامِ متحدہ کی اسمبلی کے ایک خاص اجلاس کی بھی آپ نے صدارت فرمائی یہ جون 1963ء میں طلب کیا گیا تھا اور یہ چوتھا خاص اجلاس تھا جو ایک مسئلہ پر غور کرنے کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ سابق وزیراعظم لیاقت علی خان کی تجویز تھی کہ میں پاکستان کے بطور چیف جسٹس سپریم کورٹ کا منصب سنبھالوں یا وزارتِ دفاع یا امورِ خارجہ۔ لیکن قائداعظم چاہتے ہیں کہ وزارتِ خارجہ کا قلمدان سنبھالوں لہٰذا قائداعظم کی خواہش پر آپ کو وزیرِ خارجہ مقرر کیا گیا اور آپ 1948ء تا 1954ء تک اس منصب پر قائم رہے۔ مزید براں آپ کو 1970ء میں عالمی عدالتِ انصاف (ہیگ ہالینڈ) کی صدارت کے لئے منتخب کیا گیا اور آپ کئی سال اس عدالت میں بطور جج بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ چودھری صاحب فرماتے ہیں۔

نیست از فضل و عطائے او بعید
کور باشد ہر کہ از انکار دید
قادر است و خالق و ربّ مجید
ہر چہ خواہد مے کند عجزش کہ دید؟

اس کی قدرتوں کی انتہا نہیں۔ اس انتخاب سے 36 سال قبل میری والدہ صاحبہ مرحومہ نے ایک مبشر خواب دیکھا تھا جو ان کی وفات کے 32 سال بعد اس انتخاب سے پورا ہوا۔ فالحمدللہ۔ (تحدیثِ نعمت صفحہ 700)

کشمیر۔۔انسانی المیہ

تحریر: محمد اکرم خان

یہ تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ہے۔سن 1948ء، سن 1965ء میں، 1971ء میں، ان تینوں میں مقبوضہ کشمیر میں آپ کا کوئی حمایتی نہیں تھا۔لیکن اس مرتبہ یہ صورت حال تھی کہ وادی کشمیر کا ایک ایک بچہ پاکستان کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن آپ نے کچھ بھی نہیں کیا، 62ء میں چین نے لداخ پر حملہ کیا تھا اُس وقت ہمارے لیے ایک سنہری موقع تھا، اُس وقت ہم کشمیر کو آزاد کرا سکتے تھے لیکن اُس وقت کشمیری ہمارے ساتھ نہیں تھے، کشمیریوں کے حق رائے دہی کا شور کیا جاتا ہے حالاں کہ رائے شماری کی بات ہم نے نہیں بھارت نے کی تھی، پاکستان کو چاہئے کہ وہ کشمیری کاز کو مستحکم کرے صرف کشمیری مسلمان نہیں کشمیری عوام، ہمارے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم کشمیری سرزمین کے لیے کام کریں، سپورٹ کریں اور دُوسرے ملکوں سے بھی کہیں کہ کشمیری سرزمین کا۔ کشمیری عوام کا حق بحال کرانے میں ساتھ دیں۔

سردار اشرف خان

آرٹیکل 35اے خاتمے کے بعد نریندر مودی حکومت نے کشمیریوں کے ساتھ ساتھ اقوام متحدہ کی قراردادوں کو بھی روند ڈالا۔

بھارتی اقدامات پر کشمیر انٹرنیشنل میڈیا کی زینت ضرور بنا لیکن عالمی برداری نے بھارتی اقدامات اور مظالم کی روک تھام کے لیے کوئی خاص اقدامات نہ کیے۔اقوام متحدہ نے بھی ماسوائے تشویش کا اظہار کرنے کے بھارتی حکومت کو کشمیر میں مظالم روکوانے میں کوئی کردار ادا نہ کیا، ہم نے پاکستان کے نئے نقشے میں بھارتی زیر انتظام کشمیر کو اپنا حصہ ظاہر کر کے بھارت کو ایک کڑا پیغام تو دے دیا، مگر استصواب رائے والے مطالبے کا کیا ہوگا۔

مشعال ملک

پچھلے چھ سال سے مودی حکومت کے پے در پے مجرمانہ اور ظالمانہ اقدامات نے اب کشمیر کو عالمی سطح پر صف اول کے خطرناک مسائل کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جس سے مغرب میں سیاسی اور عوامی سطح پر اس اہم مسئلہ پر وسیع پیمانے پر آگاہی پھیل رہی ہے، کشمیر ایک ایسا انسانی مسئلہ ہے جسے مزید نظر انداز کر کے ایک بہت خوفناک انسانی تباہی کا خطرہ مول لیا جا رہا ہے۔پچھلے سال پانچ اگست سے پہلے اقوام عالم کو بھارتی آئین میں کشمیر کی خصوصی حیثیت کا کوئی ادراک نہیں تھا۔پوری کشمیر وادی ایک بڑی بے رحمانہ جیل میں تبدیل کر دی گئی اور ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود مظلوم کشمیری مسلسل حالت قید میں ہیں۔

فیض رحمٰن

جب ہندوستان کے اندر الیکشن ہو رہا تھا بی جے پی کے الیکشن منشور میں تھا کہ ہم کشمیر کے اسپیشل سٹیٹس کو ختم کریں گے، لیکن بدقسمتی سے پاکستان کا وزیر اعظم کہہ رہا تھا کہ مودی الیکشن جیتے گا تو مسئلہ کشمیر حل ہوگا، ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا پاکستان کی خارجہ پالیسی مکمل طور پر ناکام ہوئی ہے، آج پاکستان کے اندر ایسی لیڈر شپ کی ضرورت ہے جس طرح ذوالفقار علی بھٹو تھے، جنہوں نے کہا تھا کہ ہم کشمیریوں کے لیے ہزار سال تک جنگ لڑیں گے، پاکستان کے ہر مکاتب فکر کے لوگوں کو آگے آنا ہوگا اور اپنی حکومت کو یہ باور کرانا ہوگا کہ پاکستان کے لوگ کسی صورت تقسیم کشمیر کو قبول نہیں کریں گے۔

سردار نزاکت علی

5۔اگست 2019 حالیہ تاریخ کا وہ سیاہ ترین دن ہے، جب مودی سرکار نے بھارتی آئین کے آرٹیکل 135اے اور آرٹیکل 370 کو کالعدم قرار دے دیا۔ان آرٹیکلز کے تحت مقبوضہ کشمیر کو ایک خصوصی آئینی حیثیت حاصل تھی اور اس کا تشخص دیگر بھارتی ریاستوں سے مختلف تھا۔بھارت کا یہ اقدام اقوام متحدہ اور سیکوریٹی کونسل کی قراردادوں کے برخلاف ہے جس کے تحت کشمیر کو ایک متنازعہ علاقہ قرار دیا گیا ہے۔ان آرٹیکلز کے خاتمے کے بعد مقبوضہ کشمیر کو بھارت نے آئینی طور پر اپنا باضابطہ حصہ قرار دیا ہے۔ بھارت کے اس اقدام کے خلاف گزشتہ ایک سال سے مقبوضہ کشمیر کے عوام غیر معمولی حالات سے گزر رہے ہیں۔انہیں طویل ترین کرفیو کا سامنا ہے۔معصوم بچے، ناتواں بوڑھے، خواتین گھروں میں قید ہیں، ہزاروں نوجوانوں کو لاپتا کر دیا گیا ہے۔ماورائے عدالت قتل اور بنیادی حقوق کی پامالی کا سلسلہ جاری ہے۔مقبوضہ وادی میں آبادی کا تناسب بدلنے کے لیے بھارتی سرکاری افسروں کے خاندانوں اور ہندوؤں کو ایک منظم

منصوبے کے تحت آباد کیا جا رہا ہے یہ وہی تکنیک ہے جو اسرائیل نے فلسطینی علاقوں کے لیے اختیار کر رکھی ہے۔ آرٹیکل 370 کے تحت صرف مقامی افراد ہی زمین خرید سکتے تھے اور مقامی آبادی ہی کو ملازمتیں مل سکتی تھیں۔ بھارتی اقدامات کے خلاف پاکستان نے سب سے زیادہ احتجاج کیا۔ وزیر اعظم عمران خان نے اعلان کیا کہ پاکستان کشمیریوں کی جدوجہد میں ہمیشہ کی طرح ان کے ساتھ ہے۔ انہوں نے نیویارک ٹائمز میں ایک مضمون لکھا اور دنیا کو خبردار کیا کہ اگر کشمیر کے مسئلے پر توجہ نہ دی گئی تو یہ دنیا کے لیے ایک سنگین خطرہ بن جائے گا۔ وزیر اعظم عمران خان کے توجہ دلانے پر عالمی برادری نے بھارتی اقدامات کے خلاف آواز اٹھائی۔ 5 اگست 2020 کو ایک سال مکمل ہونے پر پاکستان نے یوم استحصال کشمیر منایا اس دن پاکستان نے ملک کا نیا نقشہ جاری کیا جس میں مقبوضہ کشمیر کو پاکستان کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ یہ نقشہ اقوام متحدہ میں پیش کیا جائے گا۔ صدر مملکت عارف علوی نے عندیہ دیا کہ کشمیر کاز کو مضبوط کرنے کی خاطر قومی اسمبلی اور سینیٹ میں کشمیر کے لیے نشستیں مختص کی جا سکتی ہیں۔ ایک سال گزر جانے کے بعد مقبوضہ کشمیر میں آج بھی انسانی حقوق کی صورت حال نہایت سنگین ہے۔ پوری وادی جیل خانے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ بھارتی فورسز نے ایک سال کے دوران 214 کشمیریوں کو شہید، 1390 کو زخمی اور 13 ہزار سے زائد کشمیریوں کو گرفتار کیا۔ بھارتی فورسز نے بیلٹ گنوں سے 10 ہزار سے زائد کشمیریوں کو نشانہ بنایا۔ انٹرنیٹ سروسز کو 55 مرتبہ بند کیا گیا۔ مجموعی طور پر یہ بندش 213 دنوں پر محیط تھی۔ کرونا وائرس کے سبب کشمیریوں کے مصائب میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ لاک ڈاؤن کی آڑ میں بھارتی فورسز کو کشمیری عوام کی نقل و حرکت روکنے کا نیا بہانہ مل گیا مگر کشمیری عوام کی جدوجہد آج بھی روز اول کی طرح جاری ہے۔ اس صورت حال میں پاکستان پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دنیا بھر میں کشمیر کاز کو اجاگر کرے اور ہر سفارتی محاذ پر اپنے رابطے استعمال کرے۔ اس ضمن میں دفتر خارجہ کو اپنا بھرپور کردار ادا کرنا ہوگا، روایتی سفارت کاری کا طریقہ کار ترک کر کے جدید تقاضوں میں خود کو ڈھالنا ہوگا تاکہ ایک مضبوط بیانیہ اختیار کر کے ہر عالمی فورم میں مسئلہ کشمیر کو اٹھایا جائے۔ بھارتی فورسز کے ظلم و ستم پر مبنی وڈیوز دنیا کے سامنے پیش کی جائیں۔ ساتھ ساتھ عالمی رہنماؤں اور انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیموں سے رابطے بڑھائے جائیں اور ان کی حمایت اور تائید حاصل کی جائے۔

گزشتہ ایک سال کے دوران پاکستان نے کشمیر کاز کے لیے کیا اقدامات کیے؟ کشمیریوں کی جدوجہد کو کس طرح اخلاقی اور سفارتی سطح پر دنیا میں روشناس کرایا؟ عالمی برادری نے کشمیریوں کا کس حد تک ساتھ دیا؟ اسلامی ملکوں کا کیا ردعمل رہا؟ آئندہ کے لیے پاکستان کا کیا لائحہ عمل ہونا چاہئے؟ سب جاننے کے لیے یہ جنگ فورم کا انعقاد کیا گیا جس میں سردار اشرف خان، کشمیری رہنما یٰسین ملک کی اہلیہ مشعال ملک، فیض رحمٰن اور سردار نزاکت علی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جنگ فورم کی رپورٹ قارئین کی نذر کی جا رہی ہے۔

سردار اشرف خان (ماہر امور کشمیر)

ایک تو یہ بات سمجھنی چاہئے کہ 5 اگست کا واقعہ اچانک نہیں ہوا۔ گزشتہ دس سال سے بی جے پی اور ان کے حمایتی جرنیل اس معاملے کو اٹھا رہے تھے کہ پاکستان کے ساتھ ہمارا معاملہ سیٹل نہیں ہو رہا۔ لہٰذا جموں و کشمیر اور لداخ کو الگ کر دیں۔ تو ایسا بالکل نہیں تھا کہ پاکستان کو کوئی بے خبری نہیں تھی اور ایسا بھی نہیں تھا کہ پاکستان کے جو پالیسی ساز ہیں اور جو فوجی اسٹیبلشمنٹ ہے یا ہماری جو حکومت ہے اور بیوروکریسی ہے ان سب کو معلوم تھا کہ بی جے پی نے یہ کرنا ہے اور اس کا فائنل راؤنڈ اس وقت ہوا جب صدر ٹرمپ کے ساتھ ہمارے آرمی چیف کی اور عمران خان کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں یہ این او سی دے کر آئے کہ یہ کچھ نہیں کریں گے۔ دوسرا جو حکومت پاکستان نے کام کیا وہ یہ کیا جب مودی نے الیکشن سے قبل جو حملہ کیا تو اس کے جواب میں پاکستان کا جو ردعمل تھا وہ چاہے سعودی عرب کے کہنے پر ہو چاہے وہ یو اے ای کے کہنے پر ہو، چاہے امریکا اور برطانیہ کے کہنے پر ہو لیکن یہ بہت ہی بزدلانہ اور کمزور تھا۔ بھارت نے کنٹرول لائن پر نہیں بین الاقوامی سرحد پر حملہ کیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا کہ ہم نے یہ کر دیا وہ کر دیا۔ ہماری فورس نے وہاں جا کر بم ڈراپ نہیں کیا اور کیوں نہیں کیا کیونکہ ان کا آرمی چیف وہاں بیٹھا ہوا تھا، کیوں کیا وہ آپ کا ماما لگتا ہے؟ یہ پاور کی دنیا ہے اگر آپ ان پر بم گرا دیتے تو نہ مودی جیتتا نہ ہی کشمیر میں 5 اگست والا واقعہ ہوتا۔ اس چیز نے اور پھر آپ نے جو بیس گھنٹے کے اندر اندر ان کا پائلٹ واپس کیا تو انہوں نے سوچا کہ پاکستان تو بالکل ہی لیٹ گیا ہے۔ الیکشن سے پہلے جب عمران خان مودی سے ملنے گئے تھے تو یہ انڈین کو کہہ کر آئے تھے کہ ملٹری میرے ساتھ ہے، آپ جو کرو گے کشمیر میں، ہم اس پر آپ سے لڑنا نہیں چاہتے۔ 5 اگست کا جو ایکشن ہے اس کے جواب میں تو آپ نے کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ہے۔ سن 1948ء، سن 1965ء میں، 1971ء میں، ان تینوں میں مقبوضہ کشمیر میں آپ کا کوئی حمایتی نہیں تھا۔ لیکن اس مرتبہ یہ صورتحال تھی کہ وادی کشمیر کا ایک ایک بچہ پاکستان کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں پاکستان بچائے گا لیکن آپ نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اس اقدام سے قبل وہاں دس بارہ ہزار جنگ جو تھے جو اب دو ڈھائی سو رہ گئے ہیں۔ باقی کہاں ہیں؟ اگر انہیں ہماری ایجنسیوں نے تیار کیا تھا تو وہ مر کیوں گئے؟

پاکستان ان لاشوں کا ذمے دار ہے، اور جو سات آٹھ لاکھ زخمی اور بیوہ ہو گئے ان کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ بہت بڑا داغ ہے جو ہمیشہ ہمارے دامن پر رہے گا۔ اسی لیے علی گیلانی نے جو ہمیشہ پاکستان کی حمایت میں تھا اب اس نے ہاتھ اٹھا لیے ہیں۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ 5 اگست کے اقدام کی پورے ہندوستان نے حمایت کی، ساری دنیا

نے حمایت کی ہے اور سعودی عرب اور امارات نے بھی۔ جب آپ خود ہتھیار ڈال دو گے تو دوسرا کیسے آپ کی حمایت کرے گا۔ سعودی عرب نے کہا کہ آپ مسئلہ کشمیر کو اسلامی مسئلہ نہ بنائیں۔ یہ آپ کا اور ہندوستان کا مسئلہ ہے۔ یا کشمیریوں کا یا بھارت اور پاکستان کا مسئلہ ہے۔ یہ اس حوالے سے عالمی مسئلہ تو ہے کہ یہ دو ملکوں کے درمیان ہے۔ لیکن یہ اسلامی مسئلہ نہیں ہے۔ سعودی عرب کا موقف بہت واضح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح پوزیشن ہے۔ آپ کیوں مدد کی توقع رکھتے ہیں کہ اگر وہ اس قابل ہوتے تو وہ کیوں جا کر امریکا سے مدد مانگتے۔ کہ ہماری حفاظت کے لیے اپنی فوج بھیجو۔ ان کے پاس تو زیادہ سے زیادہ صرف پیسے ہیں جو انہوں نے پتہ نہیں کہاں رکھے ہیں اور وہ کسی کو اجازت کے بغیر دے بھی نہیں سکتے۔ تو 5 اگست کا جو واقعہ ہے وہ بھارتی آئین کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ مسئلہ کشمیر پر پاکستان اور بھارت ایک ہی لائن پر چلے ہیں۔ بھارت مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں لے کر گیا۔ آپ کی کسی نے کوئی بات نہیں مانی اور آپ نے تب بھی کوئی اعتراض نہیں کیا، انڈیا نے کشمیریوں سے وعدہ کیا ہے کہ ہم آپ کو حق خود ارادیت دیں گے، بھارت نے دھوکہ دیا یا کشمیریوں کو شیخ عبداللہ کو۔ لیکن آپ اس دھوکے میں کیوں شریک ہوئے؟ انہوں نے پہلے وہاں وزیر اعظم رکھا پھر چیف منسٹر رکھا۔ وہ متعلقہ دفعات رفتہ رفتہ کالعدم کرتے گئے۔ 35 اے جائیداد خریدنے سے متعلق تھا اب وہ بھی کالعدم ہو گیا ہے۔ وہ آپ گلگت اور بلتستان میں پہلے ہی کر چکے ہو۔ آزاد کشمیر میں آپ نے نہیں کیا۔

آزاد کشمیر تو گلگت اور بلتستان کے لوگوں نے آزاد کرایا لیکن کیا آپ اس کا اعتراف کرتے ہو۔ کبھی دنیا میں ایسا ہوا ہے کہ کوئی آزاد کرا کر علاقہ آپ کو دے دے۔ تو اس لیے جو 5 اگست کا اقدام ہے اسے تو آپ نے خود انڈوس کیا ہے۔ ورنہ یہ پاکستان کے لیے انتہائی سنہری موقعہ تھا اور لائف ٹائم اپر چیونٹی تھی کہ ننانوے فیصد نہیں پورے سو فیصد کشمیری آپ کے ساتھ تھے۔ آپ کو کچھ نہیں کرنا تھا۔ صرف آزاد کشمیر کے لوگوں کو اشارہ کرنا تھا کہ جاؤ ویسے آزاد کشمیر کے عوام میں زیادہ تر سابق فوجی ہیں۔ لیکن آپ نے کچھ نہیں کیا۔ 5 اگست کا اقدام سراسر بھارتی آئین کی خلاف ورزی ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ نے اس پر ابھی تک فیصلہ نہیں دیا ہے۔ اگر فیصلہ آئے بھی تو کچھ نہیں ہوگا۔ جس طرح افضل گرو کے معاملے میں ہوا۔

سپریم کورٹ نے کہا کہ اس آدمی پر کوئی الزام نہیں۔ کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن یہ جو تاثر ہے کہ یہ بھارت کے خلاف دہشت گردی میں ملوث ہے تو اس کی وجہ سے ہم اسے پھانسی کی سزا دے رہے ہیں۔ دنیا میں کیا اس طرح ہوتا ہے کہ کسی شخص کے خلاف تصور کی بنیاد پر اسے سزا دے دی جائے۔ جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا تعلق ہے۔ کشمیر میں جو باتیں ہوئی ہیں کہ جو پرو انڈین کشمیری لیڈر تھے۔ شیخ عبداللہ کا جو خاندان تھا وہ بھی انڈیا کے خلاف ہو گیا۔ جو مفتی تھے وہ بھی خلاف ہو گئے اور جو کشمیری عام آدمی تھا وہ بھی بھارت کے خلاف ہو گئے لیکن ان کو کسی نے گھاس نہیں ڈالی نہ ان کو پاکستان کی طرف سے کوئی حمایت ملی نہ ہم نے ان کی کوئی مدد کی۔ جب محبوبہ مفتی نے کہا کہ میں بھی چاہتی ہوں، پاکستان میری بات سنے تو اس کا کیا مطلب تھا۔ یا وہ پاکستان کی مدد کی طالب تھی مگر یہاں خاموشی تھی جو آپ کے ساتھ ملنا چاہتے تھے آپ کے ساتھ وفاداری کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے ان کے ساتھ یہ کیا۔ کیا یہ جرم نہیں ہے؟ کشمیریوں کی اپنی غلطیاں ہیں لیکن اب وہاں کی ساری کی ساری لیڈر شپ قید میں ہے۔ چاہئے وہ انڈین کے حامی تھے یا خلاف تھے۔ انہوں نے ہر اس آدمی کو جو بی جے پی کا رکن نہیں تھا اسے بند کر دیا۔ صرف فاروق عبداللہ اور عمر عبداللہ کو پے رول پر چھوڑا ہوا ہے۔ وہ بھی اس شرط پر کہ وہ بات نہیں کریں گے۔

اس کے بعد اُنہوں نے لداخ کو کاٹ دیا، جموں کو بھی کاٹ دیا حالاں کہ جموں فیڈرل ٹیک اوور کا حمایتی نہیں ہے۔ وہاں اکثریت مسلمانوں کی نہیں غیر مسلموں کی ہے۔ وہ مرکزی حکومت کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے لداخ والے بھی یہی کہتے ہیں کہ ان کا تعلق وادی سے نہیں ہے۔ تیسرا کام بھارت یہ کر رہا ہے کہ وہاں تقسیم در تقسیم کا عمل جاری رکھا ہوا ہے۔ بھارتی فوج نے مقبوضہ کشمیر کے مختلف علاقوں کو الگ الگ بانٹ دیا ہے۔ ہر محلّے میں ہر روز گھروں کی تلاشی لیتے ہیں اس تلاشی کے دوران بوڑھی عورتوں کو نوجوان عورتوں کو الگ کر دیتے ہیں اور جو بوڑھے مرد ہیں نوجوان ہیں انہیں دُوسری جگہ منتقل کر دیتے ہیں اور پوری پوری رات بھارتی فوجی عورتوں کے ساتھ جو مقابلہ نہیں کر سکتی زیادتی کرتے ہیں۔ اب زیادتی کا شکار عورتیں نہ کسی کو بتا سکتی ہیں نہ پولیس اسٹیشن پر شکایت درج کرا سکتی ہیں۔ گزشتہ ایک سال سے وہاں انٹرنیٹ سروس نہیں ہے، اب کسی کو کیا پتا کتنے لوگ بیمار ہیں، مر گئے ہیں۔ قبر کا نشان تک نہیں ہے۔ انسانی حقوق کی کوئی تنظیم وہاں نہیں جا سکتی۔ میڈیا پر بھی پابندی ہے۔ بارہ ہزار بچّے غائب ہیں۔ دس سال سے پچیس سال تک کے نوجوان اگر کشمیر سے نکل گئے ہیں تو زندہ ہیں وگرنہ سمجھ لیجئے وہ زندہ نہیں ہیں۔ کشمیریوں پر یہ ستم کی ایسی رات ہے جس کا سویرا نہیں ہے۔ بھارتی فوج نے وہاں جو ظلم وستم کے پہاڑ توڑے ہیں، انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس وقت کشمیریوں کی دو باتیں ہیں۔ انہیں پاکستان سے شدید ترین احساس بے وفائی ہے۔ اب وہ پاکستان سے کس طرح الحاق کی بات کر سکتے ہیں۔ او آئی سی کی قرارداد سے کیا ہوگا کیا کشمیر آزاد ہو جائے گا؟ آپ نے نقشے میں کشمیر شامل کر لیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ گلگت اور بلتستان ہمارا ہوا۔ یہی وہ بات ہے جو انڈیا کہتا تھا مگر آپ نہیں مانتے تھے۔ اب آپ کہتے ہیں کہ یہ ہمارا ری ایکشن ہے۔ ابھی یہ کوشش کر رہے تھے کہ آزاد کشمیر کو پاکستان میں ضم کر دیں۔ گجرات کے ساتھ، سیال کوٹ کے ساتھ مگر آزاد کشمیر کے لوگ اس بات کو مانیں گے نہیں۔ (باقی آئندہ قسط میں ملاحظہ فرمائیں۔)

سرکس کے شور میں دبے مقدمات

تحریر: محمد بلال غوری

قائداعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے، اسلامی مملکت یا پھر سیکولر ریاست؟ ہم جمہوریت پسند ہیں یا پھر آمریت کے دلدادہ؟ عوام کی اکثریت رجعت پسندانہ خیالات کی طرف مائل ہے یا پھر روشن خیالی پر قائل؟ پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ کرپشن ہے یا پھر اسٹیبلشمنٹ کی سیاست میں مداخلت؟ کیا واقعی کپتان کو لانے والے بھی ان سے تنگ آچکے ہیں یا یہ بات محض ڈھکوسلہ ہے؟ تہہ در تہہ چیستاں میں لپٹی یہ باتیں اور ان سے ملتے جلتے دیگر سوالات کے جواب تو مجھے معلوم نہیں لیکن ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم من حیث المجموعی اعلیٰ درجے کے فلم بیں ہیں اور ہمیں ہر آن فلم چلانے والے ڈائریکٹرز اور اسکرپٹ رائٹرز بیحد پسند ہیں۔ ہمیں ایکشن ہی نہیں، تجسس اور تحیر سے بھرپور تماشا دیکھنے کی لت پڑ چکی ہے۔ روم کے بادشاہ تو عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے سال میں ایک آدھ بار سرکس کا بندوبست کیا کرتے تھے، جہاں بھوکے شیروں اور گلیڈی ایٹرز کی لڑائی ہوتی، نوکیلے سینگوں والے بھینسوں اور غلاموں کا مقابلہ ہوتا، اسٹیڈیم میں ہو رہے اس دنگل میں محو لوگ اپنے مسائل بھول جایا کرتے مگر یہاں تو ہر روز 'لکی پاکستانی سرکس' کے کئی کئی شو ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی مداری سر پر پہنے ہیٹ سے کسی نئے ایشو کا کبوتر نکال کر دکھاتا ہے تو کئی روز اس پر بحث وتمحیص کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ کبھی براڈ شیٹ کے نام پر فراڈ شیٹ کا میلہ سجتا ہے، سینیٹ الیکشن کے موقع پر بازی پلٹ جانے کا تصور دیکھنے والوں کو تحیر وتکدر میں مبتلا کئے رکھتا ہے، کبھی چائے والا، کبھی حریم شاہ تو کبھی پاوری گرل پر توجہ مرکوز ہو جاتی ہے، گاہے کسی متنازع شخص کو اہم عہدے پر تعینات کر دیا جاتا ہے تو ناقدین یوں آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں جیسے پہلی بار کسی منظور نظر کو نوازا گیا ہو، جب یہ شخص مال بنا لیتا ہے تو اسے فارغ کر دیا جاتا ہے تاکہ کسی اور کو موقع دیا جائے اور پھر اس فراغت پر بھی طفلانِ انقلاب تالیاں پیٹتے ہیں، داد وستد کے ڈونگرے برساتے ہیں۔ جمہوری تماشے کا وہ منظر تو دم بخود کر دیتا ہے جب 'سلیکٹڈ' کا طعنہ دینے والے اپنے تئیں رفعتیں پاتے ہیں اور خود 'سلیکٹڈ' کے پاس جا کر 'سلیکٹ' ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ عدالتیں بھی عوام کو مایوس نہیں کرتیں، کبھی پاناما اور اقامہ کا شور، کبھی واٹس ایپ کا دور، کبھی گاڈ فادر تو کبھی بلیک لاز ڈکشنری کی باتیں، ڈسکہ الیکشن ملتوی کرنے کے لئے فی الفور سماعت مگر سینیٹ الیکشن کیس کی شنوائی سے یہ کہتے ہوئے گریز کہ عدالتوں کو سیاست میں نہ گھسیٹا جائے، اپنے معاملات پارلیمان میں حل کئے جائیں، عام آدمی سمجھ نہیں پاتا، کبھی جلوہ، کبھی پردہ، آخر ماجرا کیا ہے؟ اس سرکس کے شور میں مظلوموں کی چیخیں اور آہیں دب جاتی ہیں اور معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ آٹے دال کا بھاؤ کیا ہے؟ زمانہ کیسی قیامت کی چال چل چکا ہے؟ عام آدمی کی زندگی کس قدر دشوار ہو چکی ہے؟ سانحہ ساہیوال میں قتل ہونے والوں کے ورثا کو انصاف تو نہ مل سکا کہ وزیراعظم ابھی قطر سے نہیں لوٹے مگر سی ٹی ڈی کے جس افسر پر فرد جرم عائد کی گئی تھی اسے پاکستان کے اعلیٰ ترین سول ایوارڈ ستارہ شجاعت سے نواز دیا گیا ہے۔ پیٹرول پر حکومت کتنا ٹیکس لے رہی ہے؟ بجلی اب تک کتنی بار مہنگی کی جا چکی ہے؟ زرعی ملک میں بیک وقت گندم اور چینی درآمد کرنے کی نوبت کیوں آئی؟ ان موضوعات کی طرف توجہ اسلئے نہیں جاتی کہ 'لکی پاکستانی سرکس' کا میلہ بلاتعطل جاری رہتا ہے۔ ایک مداری جاتا ہے تو نیا تماشا شروع ہو جاتا ہے۔ لکھنے اور کہنے والے بھی اس سرکس کے جادوئی حصار سے نہیں نکل پاتے اور سیاسی موضوعات لے کر مصالحہ دار چارٹ بناتے ہیں مگر آج ایک عام آدمی کے حقیر سے معاملے کی جانب آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ مرد مومن مرد حق جنرل ضیاء الحق کے دور میں جب منافقت عروج پر تھی تو 1981 میں احترام رمضان آرڈیننس جاری کیا گیا۔ اس آرڈیننس کی آڑ میں پولیس کو مال بنانے کا ایک نیا موقع میسر آ گیا۔ ہر سال احترام رمضان آرڈیننس کی خلاف ورزی پر لوگوں کو گرفتار کیا جاتا ہے اور نذرانہ وصول کرنے کے بعد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لاہور کے پان فروش جمشید کو بھی 2013 میں احترام رمضان آرڈیننس کی خلاف ورزی پر حراست میں لیا گیا۔ نذرانہ نہ ملنے پر جمشید کو عدالت میں پیش کر دیا گیا، جہاں اسے پانچ دن قید کی سزا سنا دی گئی۔ غریب پان فروش نے سزا کے خلاف اپیل کی لیکن ناقص عدالتی نظام کے شکنجے میں جکڑے ہوئے عام آدمی کو 6 سال بعد انصاف ملا۔ یہ خبر کورٹ رپورٹر عابد خان نے 2019 میں رپورٹ کی لیکن جب بھی سامنے آتی ہے تو نظام عدل کا منہ چڑاتی ہے۔ یہ کسی ایک شخص کا دردناک قصہ نہیں بلکہ عدالتوں میں زیر التوا لاکھوں مقدمات کی وجہ سے لوگ انتظار کی سولی پر لٹک رہے ہیں۔ 1997 میں ڈھوک علی حیدر کے علاقے میں ایک شخص محمد اسماعیل قتل ہوا، مظہر حسین کو اس واردات کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ ایڈیشنل سیشن جج چوہدری اسد رضا نے 2004 میں سزائے موت سنا دی۔ اس فیصلے کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل کی گئی جو مسترد ہو گئی۔ مظہر حسین نے سپریم کورٹ سے رجوع کیا۔ گرفتاری کے 19 سال جبکہ سپریم کورٹ میں درخواست دائر کئے جانے کے 6 سال بعد 2016 میں جسٹس آصف سعید کھوسہ کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے تین رُکنی بنچ نے سزائے موت کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے مظہر حسین کو باعزت بری کر دیا مگر بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ تو دوران حراست ہی دو سال قبل زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا ہے۔ جسٹس آصف سعید کھوسہ نے چیف جسٹس بنتے وقت اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ زیر التوا مقدمات کے خلاف ڈیم بنانا چاہتے ہیں۔ تب سپریم کورٹ میں 39 ہزار مقدمات زیر التوا تھے، جب وہ رخصت ہوئے تو لگ بھگ 40 ہزار مقدمات زیر التوا تھے مگر سپریم کورٹ کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق زیر التوا مقدمات کی تعداد 48 ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ ماتحت عدالتوں میں زیر سماعت مقدمات کو بھی شامل کر لیا جائے تو تقریباً 20 لاکھ مقدمات زیر التوا ہیں۔ سویلین بالادستی، ووٹ کو عزت دو اور اس جیسے گمبھیر مسائل حل نہیں ہو سکتے تو کم از کم ان حقیر مقدمات کو ہی نمٹا دیں۔

سول سرونٹس قواعد 1964ء میں تبدیلیاں

تحریر: آصف بٹ

وفاقی حکومت نے ایک مرتبہ پھر سول سرونٹس کنڈکٹ رولز 1964ء میں ترامیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وفاقی حکومت کی ہدایت پر اسٹیبلشمنٹ ڈویژن نے قواعد میں ترامیم اور سفارشات کی تیاری شروع کردی ہے۔ حکومت کا موقف ہے کہ 1964ء کے قواعد فرسودہ ہو چکے ہیں اور موجودہ حالات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ جن ترامیم کے لئے تجاویز کی تیاری کا ٹاسک سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ ڈاکٹر اعجاز منیر کو دیا گیا ہے ان میں سول سرونٹس کے اہلِ خانہ کو کاروبار و سرمایہ کاری کی مشروط اجازت، میڈیا پر بیان دینے اور مضامین لکھنے، سیاسی وابستگی ظاہر کرنے کی شرط اور تحائف کا مخصوص حصہ ادا کر کے رکھنے کی اجازت دینا وغیرہ شامل ہیں۔ حکومت کی طرف سے کی جارہی سول سروسز ریفارمز پر تو شاید کسی کو بھی اعتراض نہ ہو لیکن قواعد میں ترامیم کرتے وقت چند چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہوگا۔ سیاسی وابستگی ظاہر کرنے کی شرط رکھیں گے تو بیوروکریٹس میں غیر جانبداری کا جو بچا کھچا لبادہ ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ آپ کسی افسر کو کہیں گے کہ وہ تحریری طور پر ڈیکلریشن دے کہ اس کی کس سیاسی جماعت سے وابستگی ہے تو کونسا شیر جوان ہوگا جو پی ٹی آئی کی حکومت میں یہ جرأت کرے گا کہ وہ مسلم لیگ (ن) کے ساتھ اپنی وابستگی ظاہر کرے؟ موجودہ حکومت کو کچھ بیوروکریٹس نے ہی INSECURE کر رکھا ہے خاص طور پر پنجاب میں کام کرنے والی طاقتور بیوروکریسی میں زیادہ تر افسروں کی ہمدردیاں مسلم لیگ (ن) کے ساتھ ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے کسی بھی دوسرے صوبے کی نسبت پنجاب میں چیف سیکرٹری، آئی جی، انتظامی سیکرٹری اور حتیٰ کہ کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور اسسٹنٹ کمشنروں کی سب سے زیادہ تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔

اب اس حوالے سے قانونی پہلو یہ ہے بطور سول سرونٹ نوکری لگتے وقت یہ حلف لیا جاتا ہے کہ ''وہ صرف ریاست کا وفادار ہوگا اور کسی سیاسی جماعت کے ساتھ کوئی وابستگی نہیں رکھے گا''، یہ حلف باقاعدہ تحریر شدہ ہے۔ پاکستان میں برطانوی پارلیمانی جمہوریت کی طرز کا نظام رائج ہے۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے بھی 1948ء میں بیوروکریسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ ریاستِ پاکستان کے ملازم ہیں، اس لئے آپ کی کسی پارٹی سے وفاداری نہیں ہونی چاہئے۔ قائداعظم نے پارٹیوں سے وابستگیاں بنانے کے خواہشمند افسروں کو (DISCOURAGE) کیا۔ موجودہ حکومت قواعد میں ترامیم کر کے بیوروکریسی سے سیاسی وابستگی کے حوالے سے کوئی ڈیکلریشن سائن کرواتی ہے تو یہ پاکستان میں رائج جمہوری نظام اور آئین کے بنیادی اصولوں سے بھی متصادم ہوگا۔ سب کو معلوم ہے کہ درون خانہ ہر بیوروکریٹ کی کسی نہ کسی جماعت سے AFFILIATION ہوتی ہے لیکن سول سرونٹس قواعد میں اس طرح کی MODIFICATION کرنے سے بیوروکریسی مکمل طور پر سیاست زدہ ہو جائے گی۔ حکومت کو اس PARANOID سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ بیوروکریٹس کسی اور سیاسی جماعت کا INTEREST WATCH کر رہے ہیں۔ افسروں سے ریاست کے لئے کام لینے کا اپنا مضبوط اور شفاف میکانزم بنائیں۔ حکومت کی طرف سے میڈیا پر بیان دینے، خاص طور پر سوشل میڈیا اور مضامین لکھنے کے حوالے سے 1964ء کے سول سروسز کنڈکٹ رولز میں ترامیم خوش آئند ہیں۔

1964ء کے قواعد میں میڈیا پر بیان کی حد تک تو اصول وضع کئے گئے تھے لیکن سوشل میڈیا چونکہ اس وقت نہیں تھا اس لئے اس کا ذکر نہیں۔ اس حوالے سے ترامیم کا سلسلہ تو چل رہا تھا کیونکہ جو چاہتا تھا سوشل میڈیا پر لکھ دیتا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن میں اس پر کنٹرول کے لئے ایک احتساب اور ویجیلنس سیل بنایا گیا لیکن وہ صرف اس لئے غیر فعال رہا کہ قواعد میں ترامیم درکار تھیں۔ حکومت کسی افسر کے خلاف سوشل میڈیا پر لکھنے کے بعد قانون نہ ہونے کی وجہ سے کارروائی نہیں کر سکتی تھی۔ اس ترمیم سے اچھی بات یہ ہوگی کہ ہر افسر سوشل میڈیا کے حوالے سے حکومت کو ایک انڈرٹیکنگ دے گا کہ وہ سوشل میڈیا پر ریاست کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکے گا۔ گویا حکومت افسر کو مشروط اجازت بلکہ ایک قسم کا سوشل میڈیا کو استعمال کرنے کا لائسنس دے گی۔ قواعد میں ان ترامیم کے بعد قانون کی خلاف ورزی پر افسروں کے خلاف کارروائی ہوگی اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر بے لاگ تبصرے نہیں ہو سکیں گے۔ اس سے قبل سول سرونٹس یہ کہہ سکتے تھے کس قانون کے تحت پوچھا گیا ہے کیونکہ سوشل میڈیا ریگولیشنز EXIST ہی نہیں کرتیں۔ کنڈکٹ رولز میں DEFINED قوانین کے تحت ہی افسروں کو پکڑا جا سکتا ہے۔ یہ قانون میں ایک گرے ایریا تھا جس کو FILL کرنا ضروری ہے۔

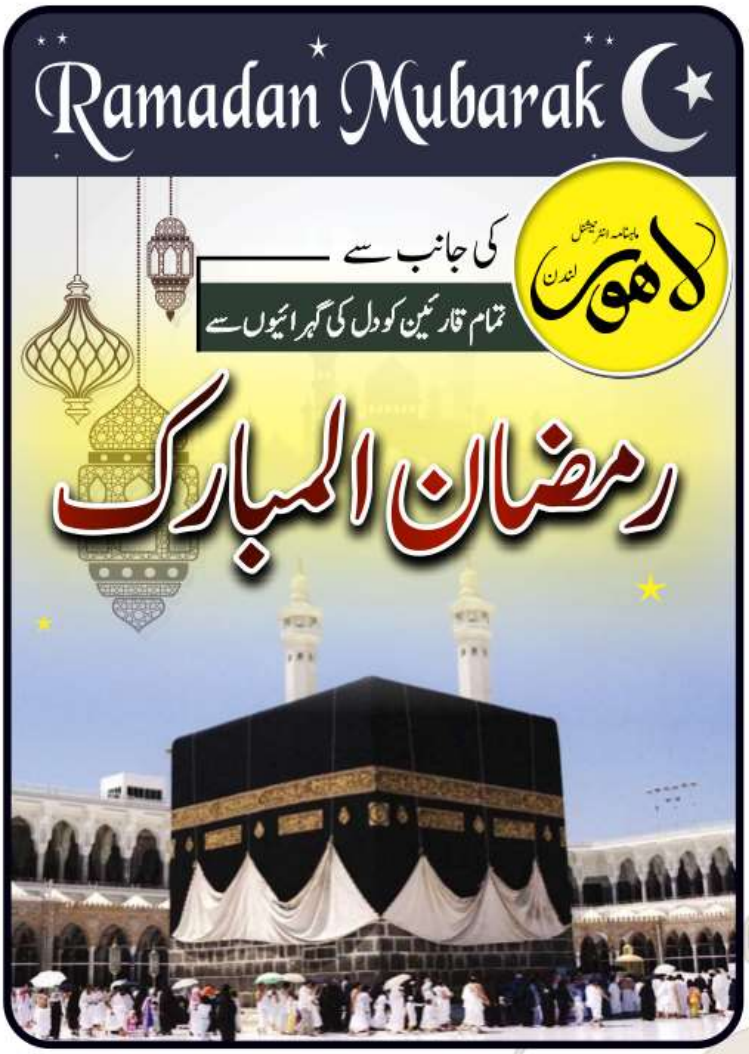

رمضان میں آبِ زمزم کے کولر ہٹانے کا فیصلہ برقرار

عالمی وبا کورونا وائرس کے پھیلاؤ سے بچاؤ کے پیشِ نظر مسجدِ حرام اور مسجدِ نبوی میں رمضان کے دوران آبِ زمزم کے کولر ہٹانے کا فیصلہ برقرار رہے گا۔ رمضان المبارک میں زائرین حرم میں آب زمزم بوتلوں میں تقسیم کی جائیگی۔

انتظامیہ کا کہنا ہے کہ افطار کے وقت بھی زمزم کی بوتلوں کی ترسیل ضرورت کے مطابق ہوگی۔ انتظامیہ کا بتانا ہے کہ مسجد حرام، مسجد نبوی میں روزانہ 2 لاکھ سے زیادہ آب زمزم کی بوتلیں تقسیم کرنے کا اہتمام ہے۔

مجھے پنجاب کو جاہل بنانے کیلئے 50 سال درکار ہونگے

انگریز نے 1849ء میں پنجاب پر قبضہ کرلیا، آپ یہ جان کر حیران ہوں گے اس وقت پنجاب میں تعلیم سو فیصد تھی، انگریز اس تعلیم کو "خطرناک" سمجھتا تھا، چنانچہ یہ لوگ کنگز کالج لندن کے ایک نوجوان پروفیسر گوٹلیب ولیم لیٹنر کو لاہور لے آئے، لیٹنر بھی ایک عجیب وغریب تھا، یہ 50 زبانیں جانتا تھا، عربی، ترکی اور فارسی مقامی لوگوں کی طرح بولتا تھا، کچھ عرصہ "مسلمان" بھی رہا تھا۔ اس نے داڑھی بڑھا کر اپنا نام عبدالرشید سیاح رکھا اور تمام اسلامی ملکوں کی سیاحت کی، وہ مسجدوں میں نماز تک پڑھ لیتا تھا، وائسرائے نے اسے ہندوستان بلایا اور اسے پنجاب کا نظام تعلیم بدلنے کی ذمہ داری سونپ دی، لیٹنر نے پنجاب کا دورہ کیا اور وائسرائے کو لکھا، مجھے پڑھے لکھے پنجاب کو جاہل بنانے کے لیے 50 سال درکار ہوں گے، وائسرائے نے اسے 50 سال دے دیے، اسے انسپکٹر جنرل آف سکولز پنجاب بنا دیا تھا، لیٹنر کو گورنمنٹ کالج لاہور کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ اس نے آگے چل کر پنجاب یونیورسٹی کی بنیاد بھی رکھی، یہ ان دونوں اداروں کا ابتدائی سربراہ تھا، انگریز نے پنجابیوں کو غیر مسلح اور ان پڑھ بنانے کے لیے پنجاب میں "ہتھیار جمع کرائیں اور حکومت سے تین آنے لے لیں اور عربی" "سنسکرت" اور "گورمکھی" کی کتاب دیں اور چھ آنے وصول کرلیں" جیسی سکیم بھی متعارف کرائی اور پورے پنجاب سے کتابیں اور اسلحہ جمع کرلیا، انگریز نے اس کے بعد انگریزی زبان کو سرکاری اور دفتری زبان بنا دیا اور سکولوں کو عبادت گاہوں سے الگ کر دیا۔ جاگیرداروں اور زمین داروں کے بچوں کو انگلش میڈیم تعلیم دے کر متوسط طبقے کو دبانے کی ذمہ داری بھی دے دی گئی، انگریزوں کو سمجھدار، قانون پسند اور انصاف کا پیکر بنا کر پیش کرنا بھی شروع کر دیا گیا، دھوپ گھڑی پر پابندی لگا دی گئی اور مقامی زبانوں اور کتابوں کو جہالت کا مرکب قرار دے دیا گیا، ولیم لیٹنر کا منصوبہ کامیاب ہوگیا اور اس نے 50 کی بجائے 30 برس میں پورے پنجاب کو غیر تعلیم یافتہ اور جاہل بنا دیا، لیٹنر نے اپنے ہاتھ سے لکھا" میں نے پورے پنجاب کا دورہ کیا۔ آج یہاں کوئی پڑھا لکھا شخص نہیں" اس نے سیالکوٹ کے ایک گاؤں چوڑیاں کلاں کی مثال دی، اس کا کہنا تھا، میں پنجاب آیا تھا، تو اس گاؤں میں ڈیڑھ ہزار پڑھے لکھے لوگ تھے، آج یہاں صرف 10 لوگ گورمکھی اور ایک اردو پڑھ سکتا ہے اور یہ بھی چند برسوں میں مرکھپ جائیں گے، لیٹنر نے پنجاب میں رہ کر اردو سیکھ لی اور پھر اردو میں دو جلدوں کی تاریخ اسلام لکھی، جس کی صحت پر کسی کی شرح نہیں ہے، یہ کتاب 1871ء اور 1876ء میں دوسری بار شائع ہوئی، لیٹنر 1870ء کی دہائی میں اپنا کام مکمل کر کے برطانیہ واپس چلا گیا۔ اس کا جاری کردہ مشن اس کے مرکھپ جانے کے بعد آج بھی کامیابی سے جاری وساری ہے۔ (تحقیق: محمد سلام نشتر۔ سرپرست تحریک نفاذ اردو پاکستان)

کڑکتی بجلی کی وجہ سے زمین پر زندگی کی ابتداء ہوئی...شاید!

نیویارک: آج سے اربوں سال قبل برقی شراروں نے زمین پر فاسفورس کی مقدار بڑھائی تھی جس سے حیات کے لیے ابتدائی سامان پیدا ہوا تھا۔

ایک نئی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ کڑکتی ہوئی بجلی سے زمین پر زندگی کے لیے لازمی اجزاء بکھیرے تھے اور اس کے بعد حیات پیچیدہ ہوتی چلی گئی تھی۔ یہ تحقیق ییل یونیورسٹی کے شعبہ ارضیات کے طالبعلم بنجامن ہیس نے کی ہے جو ان کی پی ایچ ڈی مقالے کا مرکزی حصہ بھی ہے۔ بنجامن ہیس کہتے ہیں کہ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے فاسفورس ایک اہم عنصر ہے۔ لیکن اربوں سال تک یہ زمین پر عام دستیاب نہ تھا اور زمین کی غیر حل پذیر معدنیات میں کہیں پھنسا ہوا تھا۔ اس تحقیق میں ماہرین نے زور دے کر کہا ہے کہ آخر ایسا کب اور کیونکر ہوا جب زمین پر فاسفورس مفید اور قابلِ عمل بنا اور یوں اس نے زندگی کے بنیادی ترین اجزاء مثلاً ڈی این اے، آر این اے اور دیگر حیاتی سالمات کی بنیادی اینٹ کا روپ دھارا۔ پہلے انہوں نے شرائبر سائٹ نامی مخصوص شہابی پتھروں پر غور کیا جس میں فاسفورس موجود ہوتی ہے۔ زمین پر یہ پتھر گرتے رہے ہیں اور ان کے تصادم سے عین ممکن تھا کہ زندگی ابتدائی حالت میں جاگ اٹھے۔ لیکن یہ نظریہ یوں فٹ نہیں بیٹھتا کہ کرہِ ارض پر ساڑھے تین سے ساڑھے چار ارب سال کے درمیان اولین زندگی یا اس کے بنیادی اجزاء بنے لیکن اس عرصے میں شہابیوں کا تصادم بہت ہی کم ہو چکا تھا۔ لیکن انہی شرائبر سائٹ شہابیوں میں فاسفورس کا ایک اور مقام دریافت کیا جو 'فلگر ائٹس' کہلاتے ہیں اور ایک قسم کا شیشہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ شیشے بھی اس وقت بنتے ہیں جب آسمانی بجلی کا زوردار عمل ہوتا ہم ان میں فاسفورس حل پذیر (سولیوبل) صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک کمپیوٹر ماڈل بنایا گیا تو معلوم ہوا کہ قدیم زمین پر سال میں ایک سے پانچ ارب مرتبہ زوردار بجلی کڑکتی تھی اور ان میں سے دس کروڑ سے ایک ارب مرتبہ بجلی زمین پر ضرور گری ہوگی۔ اس طرح شہابیوں میں پھنسی فاسفورس آزاد ہو کر اس قابل ہوئی کہ اولین حیاتیاتی کیمیکل بنا سکے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ شاید بجلی کے شراروں نے فاسفورس کی راہ ہموار کی اور اس سے زندگی کی ابتدائی شکل کا ظہور ہوا تھا۔

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے" ملاہور رسالہ ہر دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بزنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپکی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہوگی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بنک میں جمع کروا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account No:
42534160
Sort Code:
30-96-26
IBAN: GB89Loyd
3096242534160

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔

ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

بھارتی سپریم کورٹ میں قرآن کریم سے متعلق دائر کی گئی درخواست اور ہمارا ردعمل

تحریر: ڈاکٹر طارق احمد مرزا

لطیفہ ہے کہ ملا نصیرالدین چوپال میں چارپائی ڈال کر چادر تانے سو رہے تھے کہ بچوں کو شرارت سوجھی۔ ان میں سے ایک نے انہیں جھنجھوڑ کر جگایا اور چیختے ہوئے بتایا کہ فلاں بچہ آپ کی ریش مبارک استرے سے صاف کر کے لے گیا ہے۔ ملا نصیرالدین ہڑبڑا کر اٹھے۔ آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا، دُور ایک بچہ (طے شدہ پروگرام کے مطابق) بھاگتا جا رہا تھا۔ پھر کیا تھا آپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بے نقط مغلظات سناتے، شور مچاتے ہوئے آپ نے بھی اسی سمت دوڑ لگا دی۔ مگر بچے نے بھلا کہاں ہاتھ آنا تھا۔ ڈیڑھ دو کلومیٹر دوڑنے کے بعد تھک ہار کر آپ ہانپتے کانپتے ایک درخت کے سہارے کھڑے ہو گئے مگر واویلا جاری رکھا۔ آخر ایک دیہاتی وہاں سے گزرا، ماجرا پوچھا تو جواب سن کر بمشکل ہنسی پہ قابو پاتے ہوئے بولا ملا جی آپ اتنے عالم فاضل شخص ہیں پہلے اپنے چہرے پہ ہاتھ تو پھیر کر دیکھ لیتے، ریش مبارک تو اسی طرح سے موجود ہے!۔

بدقسمتی سے برصغیر کے، خصوصاً بھارتی مسلمانوں نے کچھ اسی قسم کا ردعمل بھارتی سپریم کورٹ میں وسیم رضوی کی طرف سے دائر کردہ ایک ایسی درخواست کی خبر ملنے پر دکھایا ہے جس میں سپریم کورٹ سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ قرآن کریم کی 26 ایسی آیات کو حذف کروائے جو ان کے نزدیک نعوذ باللہ مسلمانوں کو دہشتگردی پر اکساتی ہیں۔ اس احمقانہ درخواست پر بھارت میں مسلمانوں نے جس طرح سے احتجاجی جلسے جلوس نکالنے شروع کر دیئے ہیں اور حتیٰ کہ وسیم رضوی کے سر کی قیمت بھی مقرر کر دی ہے تو یہ ردعمل بھی ایک بالغ نظر عقلمند مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ کیونکہ کم از کم اتنا علم تو ہونا چاہیئے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، اسی نے نازل کی ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی بڑے کھلے کھلے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہوا ہے۔ پس جب آپ اس قسم کا ردعمل دکھاتے ہیں تو آپ کا یہ عمل ثابت کرتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ پر بھروسہ نہیں۔ آپ کو شک ہے کہ کہیں واقعتاً ایک ملک کی سپریم کورٹ اس قسم کا حکم بھی جاری کر دے گی اور خاکم بدھن اس پر پوری دنیا میں عملدرآمد بھی شروع ہو جائے گا۔ کلمہ ایمان یعنی "آمنت باللہ" کی پہلی شق اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے جس کی ہر مسلمان (اقرار باللسان) اور (تصدیق بالقلب) کرتا ہے لیکن محض اقرارِ لسانی ہو اور تصدیقِ قلبی نہ ہو تو یہی نمونہ ظاہر ہوتا ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔

یاد کریں جب ابرہہ ہاتھیوں کا لاؤ لشکر لے کر خانہ کعبہ کو تہس نہس کرنے کی نیت سے مکہ پر حملہ آور ہوا اور پہلے کچھ لوٹ مار شروع کی تو حضرت عبدالمطلب جو نبی پاک حضرت خاتم النبیین ﷺ کے دادا تھے اس کے سپہ سالاروں کے پاس آئے اور کہا کہ تم لوگوں نے میری جو بکریاں اور اونٹ وغیرہ قبضہ میں لے لئے ہیں میں انہیں لینے آیا ہوں۔ اس پر ان فوجیوں نے ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ اس کو اپنی بکریوں کی پڑی ہوئی ہے، خانہ کعبہ کی حفاظت کی کوئی فکر نہیں جسے مسمار کرنا ہمارا اصل مقصد ہے۔

یہ بات سن کر آپ نے فرمایا کہ میں جس چیز کا مالک ہوں اسی کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں، خانہ کعبہ کا مالک خدا ہے اور وہی اس کی حفاظت کرے گا!۔

اور پھر تاریخ نے ان کی بات سچی ثابت کر کے دکھا دی۔ اسی طرح سے پندرہ سو سال ہو گئے، قرآن کریم بھی، جس کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے کیا ہوا ہے، محفوظ چلا آتا ہے۔ ظاہری کتاب کی شکل میں بھی، سافٹ ویئر کی صورت اور انٹرنیٹ پر بھی اور ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں حفاظ کرام کے دماغوں میں بھی۔ تاریخ میں کئی ایسے واقعات ہیں جب قرآن میں تحریف، یا اس کی الہامی حیثیت کو مشکوک بنانے کی کوشش کی گئی لیکن ناکام رہی۔ ابھی گزشتہ صدی کا ایک واقعہ ہے کہ ہندوستان میں ایک شخص کو یہ سوجھی کہ قرآن کا نسخہ مختلف کاتبوں کے پاس باری باری لے کر گیا اور کہا کہ اگر وہ قرآن کریم میں موجود "خاتم النبیین" میں موجود لفظ "خاتم" کی زبر مٹا کر زیر لگا دیں تا کہ اسے "خاتِم" پڑھا جائے، تو وہ اس کا بھاری معاوضہ دے گا لیکن سب نے انکار کر دیا۔ گھر واپس آ کر یہ مذموم حرکت کرنے کا خود فیصلہ کر لیا لیکن قلم اٹھایا ہی تھا کہ اسی وقت قرآن کریم کے محافظ خدا نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ ایک نشان عبرت بن گیا۔ قارئین کرام میرے دل میں بھارتی مسلمانوں کے جذبات نہایت مکرم بلکہ مقدس ہیں۔ لیکن ان سے یہ عاجزانہ درخواست ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کے الٰہی وعدہ کو سمجھیں اس پر اپنا ایمان پختہ کریں۔۔ جتنا زیادہ منفی ردعمل دکھائیں گے، اس وسیم رضوی نامی شخص کو دنیا بھر خصوصاً مغرب میں موجود اسلام دشمن طبقہ میں شہرت اور اہمیت دلانے کا باعث بنیں گے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ جلوس نکالنے یا قتل کے فتوے جاری کرنے کی بجائے جن 26 آیات کو وسیم رضوی نے متنازعہ بنانے کی کوشش کی ہے ان کی سیاق وسباق کے حوالہ سے اس طرح کی درست تشریح پیش کریں جو اسلام کا اصل یعنی امن اور سلامتی کا پیغام دینے والی اور غلط فہمیاں زائل کرنے والی ہو۔ اس حوالہ سے راقم کے مشاہدہ میں بات بھی آئی ہے کہ بعض لکھنے والے (جو جلوسوں میں شامل نہیں

ہوتے، لکھتے ہیں اور بظاہر "سکالر" دکھائی دیتے ہیں) بجائے اس کہ وسیم رضوی اور اس کے ہم خیال طبقہ کو مذکورہ آیات کے بارہ میں درست آگہی فراہم کریں، وہ ہندو دھرم کی کتابوں یا بائیبل وغیرہ سے اسی قسم کی عبارات ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیش کرنے میں مصروف ہو گئے ہیں کہ دیکھو ان کی کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے۔ حالانکہ وسیم رضوی نہ تو ہندو ہے اور نہ ہی عام یا انتہا پسند ہندوؤں نے اس کے اس قابل صد مذمت اقدام کی حمایت کی ہے بلکہ بریت کا اظہار کیا ہے۔ میری حقیر رائے میں اگر دونوں طرف سے الزامی جوابات اسی طرح سے لگائے جاتے رہے کہ تم بھی تلوار کا ذکر کرتے ہو ہم بھی تلوار کا ذکر کرلیں تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔ ان باہمی الزامات کو سننے یا دیکھنے والی نوجوان نسل، جس کا ادیان عالم اور ان کی مقدس کتابوں کے بارہ میں زیادہ علم نہیں وہ تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ کیا ہندو، کیا عیسائی اور کیا مسلمان، سبھی ایک جیسے ہیں، سبھی تلوار اور قتال کی تعلیم کے حامل ہیں۔ اور سیکولر طبقہ جو یہ کہتا چلا آرہا ہے کہ مذہب بنیادی طور پر ہے ہی جملہ فساد کی جڑ، تو یہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔

تو ایسے میں جیسا کہ آج سے سو برس قبل برصغیر میں یہ تحریک شروع کی گئی تھی کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے بجائے ایک دوسرے پر الزامی حملے کرنے کے، ایسے اجلاسات اور کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کریں جن میں اپنے اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کی جائیں اور سوالات کے جوابات دے کر ان کے بارہ میں پھیلائی گئی غلط فہمیاں دور کی جائیں نہ کے دوسروں پر اعتراض۔ آج کا نوجوان اس میں دلچسپی نہیں رکھتا کہ آپ دوسروں کی کتابوں سے کیا کچھ نکال نکال کر دکھانے میں کمال رکھتے ہیں، بلکہ یہ جاننے کی خواہش رکھتا ہے کہ آپ اپنے مذہب کی وکالت میں کس حد تک حق کے متلاشیوں کو مطمئن کر پاتے ہیں۔ جہاں تک وسیم رضوی کی اس درخواست کے قانونی پہلوؤں کا تعلق ہے تو ان کا جائزہ لیتے ہوئے قانونی ماہرین نے بتایا ہے کہ ابھی تو یہ بھی طے ہونا ہے کہ اس قسم کی درخواست بھارتی سپریم کورٹ سماعت کے لئے قبول بھی کرتی ہے یا نہیں۔ عموماً جب کسی "کتاب" کے خلاف عدالت میں درخواست دی جاتی ہے تو اس میں دوسری پارٹی یعنی "فریق مخالف" کتاب کا مصنف ہوتا ہے کیونکہ عدالت کے لئے مصنف کا نکتہ نظر بھی سمجھنا انتہائی ضروری ہوتا ہے، یکطرفہ فیصلہ تو نہیں دیا جاسکتا۔ وسیم رضوی نے کتاب کے مصنف یعنی خالق (اللہ تعالیٰ) کو تو پارٹی ٹھہرایا نہیں بلکہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ مذکورہ آیات پہلے تین خلفاء راشدین کی تخلیق کردہ ہیں۔ لیکن انہیں بھی مدعا علیہ پارٹی نہیں ٹھہرایا (ویسے وہ بھی اب دنیا میں موجود نہیں) بلکہ لگ بھگ ساٹھ عدد بالکل ہی غیر متعلق قسم کے افراد اور اداروں کو فریق بنایا ہے جو وسیم رضوی کی قابل رحم دماغی حالت کی غمازی کرتا ہے۔ اس میں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور حتیٰ کہ اردو ادب کی ایک انجمن اور کچھ مدرسہ جات کو بھی فریق ٹھہرایا ہے جس کی کوئی تک ہی نہیں بنتی۔ پھر یہ بھی واضح نہیں کیا گیا کہ کیا درخواست گزار صرف انڈیا میں موجود قرآن کریم کی کاپیوں میں تحریف کروانا چاہتا ہے یا دنیا بھر کی۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان کی سپریم کورٹ کو اس قسم کا "مینڈیٹ" حاصل ہے؟۔ دنیا بھر میں ایک ہی قرآن ہر ملک اور ہر خطے میں پایا جاتا ہے۔ کیا درخواست گزار دنیا کے دو سو سے زائد ممالک میں جا کر اس قسم کی درخواستیں وہاں کی عدالتوں میں دینے کا ارادہ رکھتا ہے؟۔ اور یا پھر کیا دنیا بھر کی حکومتیں بھی بھارتی عدالت کے ماتحت آتی ہیں؟۔

جن مدرسوں کا ذکر کیا گیا ہے کیا وہ "مدرسے" چل کر عدالت میں" بیان" حلفی دینے آئیں گے۔ کیا مدرسے بولتے ہیں؟۔ اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی۔ یہ بات خوش آئیند ہے کہ کچھ مسلمان بھارتی وکیل اس درخواست کے قانونی پہلوؤں کا بغور جائزہ لے کر عوام الناس کو سوشل میڈیا پر شعور و آگہی بہم پہنچا رہے کہ تشویش کی ضرورت نہیں، خاطر جمع رکھیں اور اپنے معمولات جاری رکھیں۔ اس قسم کی بے تکی درخواستیں پہلی پیشی پر ہی ناقابل سماعت قرار دے دی جاتی ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ وسیم رضوی نے اپنی درخواست میں اس بات کا کوئی تاریخی دستاویزی ثبوت بھی پیش نہیں کیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ قرآن مجید میں کوئی غیر الہامی عبارات داخل کی جاچکی ہیں۔ اور پھر ساتھ ہی اس بات کا اعتراف بھی وسیم رضوی نے اسی درخواست میں یہ کہتے ہوئے کیا ہے کہ اصل میں قرآن نہیں بلکہ اس کی مختلف طریق پر کی گئی تفاسیر ہیں جو کہ متضاد قسم کی سوچ کے پروان چڑھنے کا باعث بن رہی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ آپ نے کسی بھی تفسیر یا مفسر کا ذکر یا حوالہ پیش نہیں کیا۔ گویا پوری درخواست بے بنیاد مفروضوں پر مشتمل اور تضادات کا مجموعہ ہے۔ اس پر معزز عدالت ان کی درخواست یہ کہتے ہوئے خارج کرسکتی ہے کہ پھر اصل درخواست ان مفسرین کے خلاف دینی چاہیئے تھی نہ کہ قرآن کریم کے متعلق۔ جملہ معروف اور اکابر مفسرین بھی اب دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں پس لگتا ہے کہ آپ کا بیچارہ دماغ ہی ہے جس میں کم علمی کی وجہ سے تضاد اور کنفیوژن اچھی خاصی مقدار میں پیدا ہو چکا ہے۔ وسیم صدیقی صاحب آیئے اور قرآنی انوار و علوم اور ان کے اسلوب سے خود کو آشنا کرنے کی کوئی سبیل ڈھونڈیئے۔

نورِ فرقاں ہے جو سب نُوروں سے اَجلا نکلا
پاک وُہ جس سے یہ اَنوار کا دریا نِکلا
ہے قصور اپنا ہی اندھوں کا وگرنہ وہ نُور
ایسا چمکا ہے کہ صد نیّرِ بَیضا نکلا
زندگی ایسوں کی کیا خاک ہے اس دُنیا میں
جن کا اِس نُور کے ہوتے بھی دل اعمٰی نکلا
جلنے سے آگے ہی یہ لوگ تو جل جاتے ہیں
جن کی ہر بات فقط جھوٹ کا پُتلا نکلا !

آج وساکھی کا تہوار ہے

تحریر: لیاقت علی

آج 13 اپریل (بعض ممالک اور علاقوں میں 14 اپریل) کو پوری دنیا کے پنجابی بالعموم اور سکھ بالخصوص وساکھی کا تہوار منا رہے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل وساکھی ایک سیکولر اور پکا پیڈا پنجابی تہوار ہوتا تھا جو تمام پنجابی بلا لحاظ مذہب مناتے تھے۔ میلے، بھنگڑے، منڈوے اور رنگا رنگ تماشے وساکھی کا اہم جزو تھے۔ سنا ہے کہ گوجرانوالہ کے نزدیک ایمن آباد میں وساکھی کا سب سے بڑا میلہ لگتا تھا جہاں پنجاب بھر سے پہلوان، گویے، راس دھاریے اور رنگا رنگ فنون اور آرٹ کے دلدادہ شریک ہوتے تھے۔ قیام پاکستان کے نتیجے میں پاکستانی پنجابی جہاں اپنی زبان وادب سے محروم ہو گئے ہیں وہاں اب ان کے تہوار بھی ان کے نہیں رہے۔ وساکھی ہو یا پھر بسنت سب خواب وخیال ہو کر رہ گئے ہیں۔ وساکھی دیسی کیلنڈر (بکرماجیت) کے دوسرے مہینے وساکھ کی پہلی تاریخ کو منائی جاتی ہے (نانک شاہی کیلنڈر میں وساکھ کو سال کا پہلا مہینہ قرار دے دیا گیا ہے) یہ دراصل گندم کی کٹائی کے آغاز کا اعلان ہے۔ گندم پک گئی ہے اور اب اس کی کٹائی کا دن آ پہنچا ہے۔ ہر طرف خوشیوں کے ڈھول بج رہے ہیں اور کسان بھنگڑا ڈال رہے ہیں۔ سکھ مت (پنتھ خالصہ) کی بنیاد دسویں اور آخری گورو، گورو گوبند سنگھ (1798-1666ء) نے آنند پور صاحب نامہ قصبے میں 1699ء کو وساکھی کے دن ہی رکھی تھی۔ آنند پور صاحب آج کل بھارتی ریاست پنجاب کے ضلع روپ نگر میں واقع ہے۔ یہ قصبہ گورو گوبند سنگھ کے والد نویں گورو تیغ بہادر نے آباد کیا تھا۔ پٹنہ بہار میں پیدا ہونے والے گورو گوبند سنگھ نے اپنا بچپن اور لڑکپن ہماچل پردیش کے پہاڑی علاقے شوالک میں گذارا تھا۔ شوالک کا پہاڑی سلسلہ آنند پور صاحب کے نواح سے شروع ہوتا ہماچل پردیش تک جاتا ہے۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب نے جب نویں گورو تیغ بہادر کو دلی کے چاندنی چوک میں قتل کروا دیا (آج کل جہاں گورو کا سر قلم کیا گیا تھا وہاں بہت بڑا گوردوارہ سیس گنج کے نام سے قائم ہے) تو گورو گوبند رائے (گوبند سنگھ وہ خالصہ کے قیام کے بعد بنے تھے) جو نویں گورو کی اکلوتی اولاد تھے روپوش ہو گئے اور انھوں نے بال پن اور لڑکپن شوالک کی پہاڑیوں ہی میں گزارا تھا۔ مارچ 1699ء کو گورو گوبند سنگھ آنند پور صاحب میں منعقد ہونے والے وساکھی میلے میں ظاہر ہوئے اور انھوں نے ساتھیوں اور حمایتیوں سے کہا کہ وہ شخص آگے آئے جو سکھ مت کے لئے اپنی جان دینا چاہتا ہے۔ گورو کے ہاتھ میں تلوار تھی جس کا مطلب تھا کہ آگے آنے والے کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ اس ڈر اور خوف کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک شخص آگے بڑھا اور گورو اسے اپنے خیمے میں لے گئے اور کچھ دیر بعد باہر آئے تو ان کے ہاتھ میں پکڑی تلوار خون آلود تھی۔ انھوں نے پھر ایک شخص کو آگے آنے کے لئے کہا جس پر مجمع میں سے ایک عقیدت مند آگے بڑھا گورو اسے بھی خیمے میں لے گئے اور جب باہر آئے تو ان کی تلوار ایک مرتبہ پھر خون آلود تھی۔ گورو گوبند سنگھ نے یہ عمل پانچ مرتبہ دوہرایا۔ پھر گورو نے خیمہ ہٹوا دیا تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ پانچوں افراد زندہ تھے اور ان کے قدموں میں خون آلود بکریاں پڑی ہوئی تھیں۔ گورو گوبند سنگھ نے ان پانچ افراد کو پنج پیاروں کا نام دیا۔ پہلے ان پانچوں کو سکھ مت میں داخل کیا اور پھر ان کے ہاتھوں خود پہول لی (ایک قسم کی بیعت) اور پھر اس کے بعد موجود مجمع کو سکھ مت میں داخل کیا۔ اس طرح یکم وساکھ کو سکھ مت کا مہینہ پتھر رکھا گیا تھا اور وساکھی سکھ مذہب کے قیام کے حوالے سے مذہبی تہوار اور گندم کی کٹائی کے حوالے تمام پنجابیوں کا سیکولر تہوار ہے یہ تہوار تمام پنجابیوں کو بلا لحاظ مذہب جوڑتا ہے۔

رُوپے کی تاریخ

یکم جنوری 1961ء سے قبل پاکستانی روپے کی ترتیب یُوں تھی:

پُھوٹی کوڑی > کوڑی > دَمڑی > پائی > دھیلا > پیسہ > ٹکا > آنہ > رُوپیہ

3 پُھوٹی کوڑی	=	1 کُوڑی
10 کُوڑی	=	1 دَمڑی
2 دَمڑی	=	1 پائی
11/2 پائی	=	1 دھیلا
2 دھیلے	=	1 پیسہ
2 پیسے	=	1 ٹکا
2 ٹکے	=	1 آنہ
16 آنے	=	1 رُوپیہ

رُوپیہ بے چارہ جو آج بے حال ہو چکا ہے، کبھی اس ایک رُوپے میں 16 آنے، 32 ٹکے، 64 پیسے، 128 دھیلے، 192 پائیاں، 264 دمڑیاں، 2640 کوڑیاں اور 7920 پُھوٹی کوڑیاں ہوتی تھیں۔ پُھوٹی کوڑی مغل دورِ حکومت کی ایک کرنسی تھی جس کی قدر کم ترین تھی۔ اُردو زبان کے روزمرہ میں ''پُھوٹی کوڑی'' کو محاورۃً محتاجی کی علامت کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً: ''میرے پاس پُھوٹی کوڑی تک نہیں بچی!''

تاریخ کا ایک دردناک باب

تحریر: شکیل چوہدری

غلام قادر روہیلہ برصغیر کی تاریخ میں ایک انتہائی سفاک اور سنگدل شخص گزرا ہے۔ اس کا تعلق افغانوں کے قبیلہ روہیلہ سے تھے جو روہیل کھنڈ کے باسی تھے۔ وہ 1788ء میں مرہٹوں کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ تاریخ ہندوستان، مغلوں اور پٹھانوں کی نبرد آزمایوں سے بھری پڑی ہے۔ شاہ عالم ثانی 1759ء سے لیکر اپنی وفات 1806ء تک تخت دہلی پر کٹھ پتلی حکمران رہا۔ غلام قادر روہیلہ کے ہاتھوں 1787ء میں اندھا ہوا۔ غلام قادر نے 1787ء میں جب اس کی عمر کوئی 27 سال تھی، دہلی پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ غلام قادر نے یہ حیلہ تراشا کہ اس کا مقصد شاہ عالم کو ہٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ چنانچہ "اسلام کی خدمت" کے اس جذبے سے سرشار ہو کر غلام قادر نے اپنے دوست اسماعیل کے ساتھ فوج اور سامان جنگ سے لیس ہو کر دلی پر چڑھائی کر دی۔ غلام قادر کی فوجیں یکم جولائی 1877ء کو دلی کے گردونواح میں پہنچیں اور انہوں نے اسلامی حکومت قائم کرنے کے بجائے لوٹ مار، قتل و غارت گری شروع کر دی۔ مہاراجا سندھیا نے خود مصائب میں مبتلا ہونے کے باوجود اپنی افواج کا کچھ حصہ شاہ عالم کی مدد کے لیے بھیجا۔ شاہ عالم کی فوج نے افلاس زدہ ہونے کے باوجود مقابلہ کیا لیکن اسے کیا کیجیے کہ خود شاہ عالم کے معتمد اعلیٰ افسران غلام قادر سے مل گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف شاہی افواج کو غلط راستہ دکھایا بلکہ سندھیا کی بھیجی ہوئی فوج کی بھی حوصلہ افزائی نہ کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھیا کی فوج نے دلی سے کوچ کیا اور شاہ عالم بے یار و مددگار رہ گیا۔ غلام قادر کی فوجوں نے چار ہفتے تک دلی اور اطراف میں قتل و غارت کیا جس کی مثال صرف احمد ابدالی کے حملوں کے دوران میں ہی مل سکتی ہے۔ آخر کار 30 جولائی کو غلام قادر محل شاہی کے دروازے پر آیا اور درخواست کی کہ وہ شہنشاہ کی خدمات میں باریابی کا خواہش ہے۔ غلام قادر نے قرآن کی قسم کھائی کہ اس کا مقصد صرف مغل شہنشاہ سے اظہارِ وفاداری ہے۔ محل شاہی کے پاسبانوں نے شاہ عالم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ دھوکا ہے، فریب ہے۔ غلام قادر کو محل کے اندر نہ آنے دیا جائے، لیکن شاہ عالم کے بعض مشیر ایسے بھی تھے جنہوں نے یہ مشورہ دیا کہ غلام قادر نے قرآن کی قسم کھائی ہے لہٰذا اس پر اعتبار نہ کرنا اسلامی نظریات کے خلاف ہوگا اس لیے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی جائے۔ معلوم نہیں ان مشیروں کی رائے ان کے بھولپن پر مبنی تھی یا سازش پر، لیکن شاہ عالم نے اس رائے پر عمل کیا اور غلام قادر کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ جوں ہی محل کے دروازے کھلے، نہ صرف غلام قادر داخل ہوا بلکہ اس کے ساتھ دو ہزار سپاہی بھی شاہی محل میں داخل ہو گئے۔ غلام قادر کی فوج کے محل میں داخل ہونے پر کہرام مچ گیا۔ شہزادہ اکبر نے کہا کہ یا تو مجھے لڑ کر مر جانے کی اجازت دیجیے ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔ شاہ عالم نے بہ مشکل اسے روکا اور کہا کہ مشیت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔ غلام قادر دربارِ عام سے ہوتا ہوا دربارِ خاص میں پہنچا اور شہنشاہ سے مطالبہ کیا کہ اسے روپے کی ضرورت ہے لہٰذا جتنی دولت محل میں ہے وہ اسے دے دی جائے۔ شہنشاہ نے کہا کہ میرے پاس جو کچھ تھا وہ میں دے چکا ہوں، اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ غلام قادر اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ چنانچہ شہنشاہ کو ایک مسجد میں قید کر دیا گیا اور محل کی تلاشی کا کام شروع کر دیا گیا۔ دوسرے دن بادشاہ کو مسجد سے ہٹا کر محل کے اس حصے میں قید کر دیا گیا جہاں مجرموں کو رکھا جاتا تھا۔ غلام قادر کے سپاہیوں نے اب محل کے حرم کی تلاشی شروع کی۔ محل کے فرش، دیواروں اور چھتوں کو توڑا گیا لیکن اس میں وہ خزانہ نہ ملا جس کی غلام قادر کو تلاش تھی۔ شہنشاہ کی بیگمات اور کنیزوں کی تلاشی لی گی لیکن چند زیورات کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ اگلے دن محل کے در و دیوار چیخ و پکار سے گونج اٹھے۔ شہنشاہ کے ملازمین کو ہولناک اذیتیں دی جا رہی تھیں۔ انہیں آگ پر اُلٹا لٹکایا جا رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود افلاس زدہ محل میں وہ خزانہ نہ ملا جس کی غلام قادر کو تلاش تھی۔ آخر جب اذیت رسانی کے تمام طریقے ناکام ہو گئے تو غلام قادر نے شہنشاہ سے کہا کہ وہ جس طرح بھی ہو خزانے کا پتا بتائے۔ شاہ عالم نے کہا کہ تم نے سارا محل دیکھ لیا گیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ خزانہ میرے پیٹ میں ہے؟

غلام قادر نے کہا کہ اگر ضرورت ہوئی تو حقیقت کی تلاش میں خنجر کو بھی استعمال کرنا پڑے گا۔ اور آخر کار غلام قادر نے شہنشاہ کے جسم پر خنجر بھی استعمال کیا جس کے محل میں وہ قرآن کی قسم کھا کر داخل ہوا تھا۔ غلام قادر نے خنجر کیونکر استعمال کیا اس کی مختصر داستان مشہور انگریز مصنف مائیکل ایڈورڈز نے اس طرح بیان کی ہے۔ "10 اگست کے دن جب غلام قادر، شاہ عالم کے بیان سے مطمئن نہیں ہوا تو اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس کمینے کو زمین پر گرا دو اور اسے اندھا کر دو۔ چنانچہ مغل شہنشاہ کو ٹھوکر مار کر تخت سے گرایا گیا اور اس کی آنکھوں میں سوئیاں ڈالی گئیں۔ شہنشاہ درد و کرب سے چیختا رہا۔ آخر جب سوئیاں اس کی آنکھوں میں اچھی طرح پیوست ہو گئیں تو غلام قادر نے شہنشاہ سے پوچھا: "کہو اب تمہیں کچھ دکھائی دیتا ہے!" شہنشاہ نے جواب دیا: "ہاں مجھے تمہارے اور اپنے درمیان میں قرآن دکھائی دیتا ہے۔"

شہزادہ ہیری و میگھن مارکل کے انٹرویو کی دنیا بھر میں گونج

برطانوی شہزادہ ہیری اور ان کی اہلیہ میگھن مارکل کی جانب سے امریکی ٹی وی میزبان اوپرا ونفرے کو دیے گئے انٹرویو نے جہاں شاہی محل میں بھونچال مچا دیا ہے، وہیں دنیا بھر میں اس انٹرویو کی گونج سنائی دینے لگی ہے۔

خبر رساں ادارے ایسوسی ایٹڈ پریس (اے پی) کے مطابق شہزادہ ہیری اور میگھن مارکل کی جانب سے 7 اور 8 مارچ کو امریکا اور برطانیہ میں سی بی ایس ٹی وی اور آئی ٹی وی پر نشر کیے گئے انٹرویو سے دنیا بھر میں شاہی خاندان کے حوالے سے نئی بحث چھڑ گئی۔ دو گھنٹے سے زیادہ دورانیے کے انٹرویو میں میگھن مارکل اور ان کے شوہر شہزادہ ہیری نے پہلی بار کھل کر برطانوی شاہی محل کے اندر ہونے والے معاملات کو دنیا کے سامنے رکھا تھا اور کئی سنگین انکشافات بھی کیے تھے۔ طویل انٹرویو کے دوران میگھن مارکل نے انکشاف کیا تھا کہ جب وہ پہلے بچے کی امید سے تھیں تب شاہی خاندان کے کسی فرد نے شہزادہ ہیری سے پوچھا تھا کہ ان کے ہاں پیدا ہونے والے بچے کا رنگ کتنا سیاہ ہوگا؟

میگھن مارکل کا کہنا تھا کہ چوں کہ وہ شاہی خاندان کی پہلی غیر سفید فام فرد بنی تھیں، اس لیے ان کی رنگت اور ان کے ہاں پیدا ہونے والے بچے کی پیدائش سے قبل ہی اس کی رنگت سے متعلق باتیں کی جاتی تھیں۔ اسی انٹرویو میں شہزادہ ہیری نے واضح کیا تھا کہ ان کے بیٹے کی پیدائش سے قبل ہی ان کے بیٹے کی رنگت سے متعلق باتیں کرنے والے افراد ملکہ برطانیہ یا ان کے شوہر نہیں تھے۔ تاہم شہزادہ ہیری اور میگھن مارکل نے اس شخص کا نام نہیں بتایا تھا، جنہوں نے ان کے ہاں پیدائش سے قبل ہی ان کے بیٹے کی رنگت سے متعلق سوالات کرنا شروع کر دیے تھے۔ انٹرویو کے دوران میگھن مارکل نے شاہی محل میں نسلی امتیاز اور ذہنی مسائل کے شکار ہونے جیسے معاملے پر بھی کھل کر بات کی تھی اور بتایا تھا کہ انہوں نے مسائل سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچا تھا۔

انٹرویو میں شہزادہ ہیری نے بتایا تھا کہ انہوں نے جیسے ہی شاہی حیثیت سے دستبرداری کا اعلان کیا تو شاہی محل نے ان کی مالی معاونت بند کر دی تھی اور اس فیصلے پر انہیں تکلیف بھی پہنچی۔ میگھن مارکل اور شہزادہ ہیری کے انٹرویو کے بعد امریکا اور برطانیہ سمیت دنیا بھر میں شاہی خاندان اور شاہی محل کے رویے پر باتیں ہونے لگی ہیں اور دنیا بھر کے نامور سیاستدانوں اور سماجی رہنماؤں نے بھی ہیری اور ان کی اہلیہ سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ امریکی صدر کے ترجمان نے بھی میگھن مارکل اور ہیری کے انٹرویو پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ صدر جو بائیڈن نے ہمیشہ ذہنی صحت جیسے معاملات کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ جو بائیڈن کے علاوہ امریکا اور برطانیہ کے متعدد سیاستدانوں، ٹی وی شخصیات اور نامور صحافیوں نے بھی کھل کر بات کی ہے اور شاہی محل پر انٹرویو سے متعلق وضاحتی بیان جاری کرنے کے لیے دباؤ بڑھ چکا ہے تاہم شاہی محل نے تاحال کوئی بیان جاری نہیں کیا۔ 'رائٹرز' کے مطابق میگھن مارکل اور شہزادہ ہیری کے انٹرویو پر دنیا بھر میں بحث چھڑ جانے کے باوجود شاہی محل نے کوئی بیان جاری نہیں کیا۔

شاہی محل کے ترجمان کے ذرائع کا کہنا تھا کہ شاہی محل اس بات کی توقع نہیں رکھتا کہ اس پر میگھن و ہیری کے انٹرویو پر وضاحتی بیان جاری کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جانا چاہیے۔ تاہم دوسری جانب بی بی سی نے اپنی رپورٹ میں دعویٰ کیا کہ اگرچہ شاہی محل نے شہزادہ ہیری اور میگھن مارکل کے انٹرویو پر کوئی وضاحتی بیان جاری نہیں کیا تاہم انٹرویو کے بعد محل میں اعلیٰ سطح کا ہنگامی اجلاس کا انعقاد کیا گیا۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ شہزادہ ہیری اور میگھن مارکل کے انٹرویو کے بعد 9 مارچ کو شاہی محل میں اعلیٰ سطح کا ہنگامی اجلاس ہوا، جس میں محل کے تمام ارکان نے شرکت کی۔ اجلاس میں شہزادہ ہیری اور ان کی اہلیہ کی جانب سے انٹرویو میں کیے گئے دعووں پر غور کیا گیا تاہم اجلاس سے متعلق بھی کوئی بیان جاری نہیں کیا گیا۔

کیا بائبل کی ہجرت عظیم کی داستان ایک افسانہ ہے؟

تحریر: سٹاکس راش

خدا کے وجود کے بارے میں شکوک وشبہات کے نزول کے کچھ عرصے بعد اپنے ربی (یہودی عالم دین) سے ایک ملاقات کے دوران یوم نجات اور ہجرت عظیم پر گفتگو ہوئی۔ ربی جانتا تھا کہ میں ان داستانوں کے مافوق الفطرت اور مضحکہ خیز پہلوؤں یا واقعات کو شک وشبے کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ربی نے پورے اعتماد کے ساتھ مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہجرت عظیم کی کہانی ایک تاریخی حقیقت ہے اگرچہ مبالغہ آرائی کی وجہ سے اس داستان میں مافوق الفطرت واقعات در آئے ہیں۔ ربی کے بقول ممکن ہے مصریوں پر مینڈکوں کی بارش کا عذاب نہ آیا ہو یا موسیٰ نے بحیرہ قلزم کو چیر پھاڑ کر راستہ نہ بنایا ہو۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہودی مصر میں غلام تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہجرت عظیم ہوئی تھی اور اسی کی یاد میں ہم یوم نجات یا عید مناتے ہیں۔

شاید ربی کو معلوم نہ تھا کہ مجھے ہجرت عظیم کی حقیقت معلوم ہو چکی تھی۔ نیز میں جانتا تھا کہ یہودی تاریخ کے کسی دور میں بھی مصریوں کے غلام نہیں رہے اور ہجرت عظیم کی کہانی ایک افسانے کے سوا کچھ نہیں۔ جب پہلی بار مجھے علم ہوا کہ صحرائے سینا میں چالیس سال تک بھٹکنے والے یہودیوں کے بارے میں ایک بھی شہادت دستیاب نہیں ہوئی تو میں نے یہ سوچ کر اسے نظر انداز کر دیا صحرا میں آندھیاں چلتی رہتی ہیں۔ ممکن ہے یہودیوں کی صحرا میں موجودگی کی شہادتیں طوفانوں کی نذر ہو گئی ہوں۔ لیکن مزید مطالعہ وتحقیق کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہودیوں کی صحرائے سینا میں موجودگی کی شہادت کا نہ ملنا کوئی معمولی بات نہیں۔ بائبل کے مطابق ہجرت عظیم کے نتیجے میں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد صحرائے سینا میں چالیس سال تک قیام پذیر رہی۔ یہ کیسے ممکن ہے یہودیوں کی اتنی بڑی تعداد طویل عرصے تک صحرا میں قیام پذیر رہے اور اپنی موجودگی کی ایک بھی شہادت نہ چھوڑے؟ مزے کی بات یہ ہے کہ ہجرت عظیم سے بھی بہت پہلے انسانوں کے جن گروہوں نے مختصر مدت کے لئے اسی صحرا میں قیام کیا وہ اپنے نشان پیچھے چھوڑ گئے۔ شہادت کی غیر موجودگی کسی بھی واقعے کی صداقت پر سوالیہ نشان بن جاتی ہے۔ امریکہ میں نیفیوں اور لامنوں کی جنگ کی کوئی شہادت نہ ملنے سے مورمن کتاب کی صداقت مشکوک ہو گئی۔ ہجرت عظیم کی کوئی ایک بھی شہادت دستیاب نہ ہونے سے اب یہی صورت حال بائبل کو درپیش ہے۔ (خیال رہے مورمنوں کی مقدس آسمانی کتاب میں لامنوں اور نیفیوں کی عظیم جنگ کا ذکر ہے جس میں دونوں طرف کے لاکھوں بندے مرے بلکہ نیفیوں کا نام ونشان مٹ گیا)۔ کچھ مدت بعد بریان ڈنگ کے ایک آرٹیکل "کیا اہرام مصر یہودی غلاموں نے تعمیر کئے؟" کا مطالعہ کرنے کے بعد شک وشبے کی کوئی گنجائش نہ رہی کہ ہجرت عظیم کی داستان محض ایک افسانہ ہے۔ ہمیں بچپن سے یہ سبق رٹایا گیا تھا کہ مصریوں نے یہودیوں کو غلام بنا کر رکھا ہوا تھا اور یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت تھی جسے جھٹلانا ممکن نہیں۔ یہ "تاریخی حقیقت" ہر یہودی کی ثقافتی شناخت کا حصہ بن چکی تھی۔ میں یہودیت کے مافوق الفطرت اور مضحکہ خیز عقائد اور روایات کو مسترد کر دینے کے باوجود اپنی یہودی ثقافت جس کی جڑیں تاریخ اور غلامی میں پیوست تھیں پر فخر کرتا تھا۔ اس دوران مجھے علم ہوا کہ مشہور مبصر اور ادیب ربی ڈیوڈ وولپے بھی ہجرت عظیم کی داستان کے افسانہ ہونے کی حقیقت سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے آرٹیکل "کیا ہجرت عظیم ہوئی تھی؟" میں انکشاف کیا ہے کہ دوسرے ربی ہجرت عظیم کے واقعے کی اصل حقیقت یعنی اس کے فرضی ہونے کو چھپانے کی تلقین کرتے ہیں۔ ڈیوڈ کے بقول مافوق الفطرت واقعات کو نکال کر ہجرت عظیم کی داستان جسے بائبل کی سب سے بڑی تاریخی حقیقت یا سچائی سمجھا جاتا تھا محض ایک افسانہ ثابت ہوئی۔ اگر بائبل کی سب سے بڑی تاریخی سچائی کا یہ حال ہے تو اس کتاب کی باقی داستانیں سچی کیسے ہو سکتی ہیں؟

کیا ہمارا اخلاق یا ضمیر ہمیں اجازت دیتا ہے کہ ہم ایک ایسی فرضی داستان کو سینے سے لگائے رکھیں جو مصریوں کی عزت یا وقار پر ایک سیاہ دھبہ ہے؟ ہزاروں سال سے ہم یہودی اس وجہ سے مصریوں پر لعنت ملامت کے تیر برساتے آ رہے ہیں کہ انہوں نے ہمارے آباؤ اجداد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھا اور ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔ تاریخ، جغرافیہ، اور آثار قدیمہ سے ایک بھی شہادت دستیاب نہ ہونے کے بعد شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ یہودی کبھی مصریوں کی غلامی میں نہیں رہے۔ اس حقیقت کے طشت از بام ہونے کے باوجود یوم نجات منانا ہمارے لئے باعث شرم ہے۔ بچپن اور جوانی میں میں بڑے جوش اور جذبے سے یوم نجات (عید) مناتا تھا۔ مجھے اپنے آباؤ اجداد کی غلامی کے خلاف جدوجہد اور آزادی کے لئے کی جانے والی کوششوں پر فخر تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ یہودی یوں نجات منانا یا اس داستان کا ذکر کرنا بند کر دیں۔ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ وہ اعتراف کریں کہ یوم نجات کی بنیاد ایک افسانے پر ہے نا کہ تاریخی سچائی۔ نیز ہمارے ربی (علمائے دین) سینکڑوں ہزاروں سال مصریوں کو مطعون کرنے پر ان سے باقاعدہ معافی مانگیں۔ ایک انسان دوست ہونے کے ناتے میں یقین رکھتا ہوں کہ ہر قسم کی غلامی کے خلاف جدوجہد کرنا اور انسانوں کی آزادی کے حق میں آواز بلند کرنا ضروری ہے۔ لیکن ہم یہ کام معصوم لوگوں کو ولن بنائے بغیر بھی کر سکتے ہیں۔ یوں بھی تاریخ میں بیشمار ولن موجود ہیں۔ بہتر ہوگا کہ یوم نجات کے موقع پر ان یہودیوں کے حالات بیان کئے جائیں جنہوں نے جنگ عظیم دوم کے دوران بڑی مشکل سے جرمنی سے ہجرت کر کے اپنی جانیں بچائیں۔ اس زمانے کے بہادری اور ہیروازم کے بیشمار سچے واقعات موجود ہیں۔ نیز انھیں بیان کرتے وقت تاریخ کے فرضی اور مافوق الفطرت واقعات مثلاً "طاعون کے عذاب یا آسمان سے مینڈکوں کی بارش کا اضافہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میری رائے میں یہودیوں کو اپنے تہوار منانے کے لئے فرضی داستانوں کا سہارا نہیں لینا چاہیئے۔ ہم مافوق الفطرت دعووں اور داستانوں پر ایمان لائے بغیر بھی اپنی یہودی شناخت برقرار رکھ سکتے ہیں۔ آج بیشمار یہودی خدا پر ایمان نہیں رکھتے اور خود کو سیکولر یہودی سمجھتے ہیں۔

ترجمہ: زبیر حسین

انڈیا کی ریاست آندھرا پردیش میں گدھے کے گوشت کی مانگ میں اضافہ کیوں؟

تحریر: سرینواس لکوجو

انڈیا کی ریاست آندھرا پردیش میں ان دنوں گدھے کی طلب بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ بھینس اور بکری کے مقابلے گدھی کا دودھ بہت مہنگا فروخت ہو رہا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ پوری ریاست میں مرغے اور بکرے کے گوشت کے ساتھ ساتھ گدھے کے گوشت کی طلب میں بہت زیادہ اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ بعض افراد کا کہنا ہے کہ وہ گدھی کے دودھ کا استعمال اپنی 'صحت بہتر کرنے کے لیے' کر رہے ہیں جبکہ ان کا خیال ہے کہ گدھے کا گوشت کھانے سے 'جنسی قوت میں اضافہ' ہوتا ہے۔

طبی ماہرین کے مطابق گدھی کا دودھ صحت کے لیے مفید ہوتا ہے لیکن اس کا گوشت کھانے سے جنسی قوت پر اثرات کے کوئی سائنسی شواہد نہیں۔ آندھرا پردیش کے متعدد اضلاع میں گدھے کے گوشت کی طلب میں اضافہ ہوا ہے۔ ریاست میں جانوروں کے تحفظ کے لیے کام کرنے والی تنظیم (اینیمل ریسکیو آرگنائزیشن) کے مطابق ریاست میں گدھوں کے غیر قانونی کاروبار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ تنظیم کے اراکین کے مطابق لوگوں کا ماضی میں بھی یہ یقین تھا کہ گدھی کا دودھ پینے سے کوئی بیماری نہیں ہوتی اور اس کا گوشت کھانے سے جنسی قوت بڑھتی ہے لیکن حال میں گدھوں کی ڈیمانڈ میں زبردست اضافہ ہوا۔ تنظیم کے سربراہ سرباتولہ گوپال نے بی بی سی کو بتایا 'گدھے کے گوشت کی ڈیمانڈ بڑھ گئی ہے۔ اس لیے اس کے گوشت کی دکانیں بھی بہت کھل گئی ہیں۔ دوسری ریاستوں کے مقابلے آندھرا پردیش میں گدھوں کی تعداد کم ہے، اس لیے اب انھیں دوسری ریاستوں سے خرید کر یہاں لایا جا رہا ہے۔'

گدھے کا گوشت کھانے لائق ہوتا ہے؟

گوپال کا مزید کہنا تھا کہ 'آندھرا پردیش میں ایک گدھے کی قیمت 15 ہزار سے 20 ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ اس لیے دوسری ریاستوں کے لوگ یہاں آ کر اپنے گدھے فروخت کر رہے ہیں۔' حال ہی میں انڈیا کے مختلف علاقوں میں گدھوں کی تعداد میں کمی آئی ہے۔ اور اگر یہی حال رہا تو جلد ہی گدھے صرف چڑیا گھر میں دیکھنے کو ملیں گے۔'

ایک اندازے کے مطابق آندھرا پردیش میں فی الوقت صرف 5000 گدھے موجود ہیں۔ گوپال مزید بتاتے ہیں کہ 'فوڈ سیفٹی سٹینڈرڈ 2011 کے ضوابط کے مطابق گدھے اپنے گوشت کے لیے یا انھیں فروخت کرنے کے لیے نہیں پالا جاتا ہے، اس لیے اس کا گوشت فروخت کرنا غیر قانونی ہے۔ اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو سزا ہو سکتی ہے۔' ریاست کے شہر وشاکھاپٹنم کے میونسپل کارپوریشن کے فوڈ انسپیکٹر اپپا راؤ نے بتایا کہ 'خوراک سے متعلق قوانین کے تحت گدھے کا دودھ یا گوشت انسانوں کی خوراک کی فہرست میں شامل نہیں۔ ابھی اس بات کے کوئی شواہد نہیں کہ اس کو کھانے سے کیا ہوتا ہے، اس لیے اس کو کھانے کی فہرست میں رکھا ہی نہیں گیا۔'

ان کا مزید کہنا تھا کہ کسی بھی گوشت یا کھانے کی دیگر چیز کو اس وقت انسانوں کے لیے صحیح قرار دیا جاتا جب اس کا سائنسی ٹیسٹ کر کے اس بات کی تصدیق کر لی جاتی ہے کہ وہ انسانوں کے لیے مفید ہے یا اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

گذشتہ ایک برس میں 5000 گدھے غائب

ریاست میں جانوروں کی پرورش سے متعلق محکمے کے سابق ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر گوپال کرشنا نے بی بی سی کو بتایا کہ '2019 کی جانوروں کی مردم شماری کے مطابق ملک بھر میں گدھوں کی تعداد ایک لاکھ 20 ہزار تھی جبکہ آندھرا پردیش میں صرف پانچ ہزار گدھے تھے۔' 2012 کے سروے کے مطابق آندھرا پردیش میں 10 ہزار گدھے تھے یعنی سات برسوں میں گدھوں کی تعداد میں پانچ ہزار کی کمی واقع ہوئی ہے۔ یعنی اس میں پچاس فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔ پورے ملک میں گدھوں کی تعداد میں 61 فیصد کمی درج کی گئی ہے۔'

گدھوں کی غیر قانونی تجارت

آندھرا پردیش میں گدھوں کی تعداد میں مسلسل کمی آ رہی ہے، اس لیے غیر قانونی طریقے سے دوسری ریاستوں سے گدھے لا کر انھیں یہاں فروخت کرنے کا کاروبار بڑھ گیا ہے۔ گذشتہ دنوں پولیس نے ممبئی سے لائے گئے آٹھ گدھے برآمد کیے تھے اور گذشتہ ہفتے پولیس نے ریاست کے ڈاچاپلے علاقے میں 39 گدھے برآمد کیے تھے۔ تاہم جانوروں کے تحفظ کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کے کارکنوں کا خیال ہے کہ حقیقت میں گدھوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا غیر قانونی کاروبار ہو رہا ہے۔

اینیمل ریسکیو آرگنائزیشن سے منسلک کشور نے بی بی سی کو بتایا کہ 'ایک گلاس چائے

بنانے کے لیے جتنے دودھ کی ضرورت ہوتی ہے، گدھی کے اتنے دودھ کی قیمت 50 سے 100 روپے ہے۔' جبکہ اس کا گوشت 500 سے 700 روپے فی کلو میں فروخت ہوتا ہے۔ بعض لوگ دوسری ریاستوں سے غیر قانونی طور پر گدھوں کو یہاں لاکر فروخت کرتے ہیں اور زیادہ رقم بناتے ہیں۔'

ڈورٹو ڈور دودھ کی سپلائی

آندھرا پردیش کے متعدد ایسے اضلاع ہیں جہاں گھر گھر گدھی کے دودھ کی سپلائی ہوتی ہے۔ جبکہ بعض ایسے بازار ہیں جہاں کھلے عام گدھے کا گوشت ملتا ہے۔ گھر گھر جاکر گدھی کا دودھ فروخت کرنے والے نچار نے بتایا کہ 'اگر ہم برتن میں گدھی کا دودھ لے کر لوگوں کے گھر جاتے اور بتاتے ہیں کہ یہ گدھی کا دودھ ہے تو کوئی یقین نہیں کرتا۔ 'اس لیے ہم اپنے ساتھ گدھی کو لے کر جاتے ہیں اور وہیں ان کے سامنے دودھ نکال کر دیتے ہیں۔ راجستھان کے ہم چالیس لوگوں کا خاندان ہے اور وہ یہی کام کرتے ہیں۔ اس کے دودھ سے کئی بیماریاں صحیح ہوجاتی ہیں۔ گذشتہ بیس برسوں سے ہم لوگ یہ کاروبار کررہے ہیں۔' وجے واڑا کی دوامانے بتایا کہ 'گذشتہ 25 سالوں سے مجھے سانس لینے میں تکلیف تھی۔ جب سے میں نے گدھی کا دودھ پینا شروع کیا ہے تب سے میری تکلیف کم ہوگئی ہے۔ اب تو ہم اپنے بچوں کو بھی یہی دودھ دیتے ہیں۔ ہم لوگ اس کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ مجھے آج تک کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہے۔'

گوشت کے لیے گدھوں کی چوری

آندھرا پردیش سمیت انڈیا بھر میں پہلے گدھے کا استعمال سامان لے جانے کے لیے ہوتا تھا۔ لوگ گدھوں کی مدد سے ریت اور مٹی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جاتے تھے۔ وجے نگرم ضلع کی پولیس کا کہنا ہے کہ علاقے سے متعدد بار گدھے کے چوری ہونے کی شکایات موصول ہوتی ہیں۔ چوری کر کے گدھوں کو ان علاقوں میں بیچ دیا جاتا ہے جہاں اس کے گوشت کی ڈیمانڈ زیادہ ہے۔ گدھی کے دودھ سے جنسی قوت میں اضافے کا کوئی سائنسی ثبوت نہیں ہے، لیکن ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ گدھی کے دودھ میں وٹامن ڈی اور فیٹی ایسڈ ہوتے ہیں۔ ریاست کے نامور طبی ماہر کوٹی کو پالا راؤ نے بی بی سی کو بتایا کہ 'گدھے کے دودھ میں جو پروٹین ہوتا ہے اسے پروٹین کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ جن بچوں کو گائے یا بھینس کے دودھ سے الرجی ہوتی ہے ان کو یہ دودھ دیا جاسکتا ہے۔' لیکن اس کا گوشت کھا کر جنسی قوت میں اضافہ ہوتا ہے یا نہیں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حقیقت میں گدھوں کے گوشت میں ایسی کوئی خاصیت موجود نہیں ہے۔'

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED
CHARTERED ACCOUNTANTS
WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

Company Incorporation / Registered Office Address
Private UK Pension Tracing
Personal Income Tax Return investigations
Assets Review for Inheritance Tax
Rental Income Tax Returns
Appealing - Past years HMRC Penalties
UK State Pension Entitlement Review
Preparation / Filing of prior year tax returns
Advise on fil l ing Gaps in UK State Pension
Duplicate - Payslips / P60s
UK State Pension / (Contracted Out) Tracing

SARMAD KHAN | ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK

CELL +44 (0)7903 416 966

TEL +44 (0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002

EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM WEB WWW.SARMADGLOBAL.COM

مورمن مذہب کی مختصر تاریخ

تحریر: زبیر حسین

مورمن مذہب کا بانی جوزف سمتھ 23 دسمبر 1805ء کو امریکی ریاست ورمونٹ کے ایک قصبے شیرون میں ایک تاجر اور کسان جوزف سمتھ سینئر کے گھر پیدا ہوا۔ اس کی ماں کا نام لوسی میک سمتھ تھا۔ جوزف سمتھ جونیئر کی پیدائش کے چند سال بعد اس خاندان پر برا وقت آ گیا۔ سات سال کی عمر میں جوزف جونیئر ہڈیوں کی ایک بیماری میں مبتلا ہو گیا اور وہ تین سال تک چلنے پھرنے سے معذور رہا۔ تجارت میں نقصان کی وجہ سے جوزف سمتھ سینئر کو اپنی دکان بند کرنا پڑی۔ کئی سال فصلیں بھی اچھی نہ ہوئیں اور خاندان مقروض ہو گیا۔ زمین قرض خواہوں نے ہتھیا لی۔ خراب معاشی حالات نے سمتھ خاندان کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ ورمونٹ سے نقل مکانی کرنے کے بعد انہوں نے ریاست نیو یارک کے ایک قصبے پلمیرا کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ وہاں انہوں نے ایک فارم کی کچھ زمین کاشت کاری کے لئے کرائے پر لے لی۔ ان سے غلطی یہ ہوئی کہ زمین پر لاگ کیبن (لکڑیوں کا گھر جس پر بہت کم لاگت آتی ہے) کی بجائے روایتی مکان تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ مکان کی تعمیر پر لاگت بڑھتی گئی اور انھیں قرض لینا پڑا۔ قرضہ کی قسطیں ادا نہ کرنے پر بنک نے مکان ضبط کر لیا۔ ادھر زمین کے مالک نے بھی کرائے کی عدم ادائیگی کی وجہ سے اپنی زمین واپس لے لی۔ خاندان کی معاشی حالت ابتر ہو گئی۔ معاشی مشکلات سے نکلنے اور جلدی دولت مند بننے کے لئے سمتھ خاندان کے افراد نے جادو ٹونے میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ نیز جوزف سمتھ جونیئر اور اس کا باپ طلسماتی سلاخ اور دیکھنے والے پتھر کی مدد سے زمین میں دفن خزانوں کی تلاش میں لگ گئے۔

جوزف اسمتھ بیس سال کا تھا جب وہ اور اس کا باپ خزانوں کی تلاش میں پنسلوانیا کے قصبے ہارمنی چلے گئے۔ کوئی خزانہ تو ہاتھ نہیں آیا البتہ جوزف کو اپنے میزبان کی بیٹی امہ ہیل سے عشق ہو گیا۔ باپ کی مرضی کے خلاف امہ ہیل نے جوزف سے نکاح کر لیا۔

جوزف سینئر ایک غیر مذہبی آدمی تھا اور کبھی چرچ نہیں گیا۔ البتہ اس کی بیوی لوسی عیسائیوں کے ایک فرقہ المشیخی (پریسبیٹرین) کے چرچ جاتی تھی۔ جوزف جونیئر شش و پنج میں تھا کہ ماں کی پیروی میں چرچ جائے یا باپ کی تقلید میں چرچ سے دور رہے۔ یہی موقع تھا جب اسے خدا اور اس کے اکلوتے بیٹے یسوع مسیح کا دیدار ہوا۔ نیز خدا کے فرشتے مرونی نے زمین میں دفن سونے کے اوراق پر لکھی ہوئی ایک مقدس کتاب کی طرف اس کی رہنمائی کی۔ جوزف جونیئر نے طلسماتی پتھروں کے ایک آلے کی مدد سے اس مقدس کتاب کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر دیا۔ پہلے اس کی بیوی امہ ہیل اور پھر اس کے ایک ساتھی اولیور کاؤدری نے کتاب کی املاء کی۔ جب اس کے پڑوسیوں کو پتہ چلا کہ جوزف سمتھ ایک مقدس آسمانی کتاب چھاپنے والا ہے تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ یہ کتاب ہرگز نہیں خریدیں گے۔ پلمیرا کے باسیوں کو یقین تھا کہ جوزف سمتھ کے خاندان نے اس کتاب کے ذریعے سادہ لوح لوگوں کو ٹھگنے کی سکیم بنائی تھی۔ نیز انہوں نے کوششیں شروع کر دیں کہ کوئی مقامی پبلشر یہ کتاب شائع نہ کرے۔ مورمن کتاب 1830ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو پڑھ کر بہت سے لوگ جوزف سمتھ پر ایمان لے آئے۔ ان میں بریگم ینگ بھی تھا۔ جوزف کی طرح بریگم بھی ایک کسان کا بیٹا تھا۔ اسی سال جوزف سمتھ کے پچاس پیروکاروں کے اجلاس میں نیا چرچ قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ سب شرکاء نے جوزف کو خدا کا نبی اور نئے چرچ کا سربراہ تسلیم کر لیا۔ ادھر مقامی عیسائیوں نے اس نئے نبی کی مخالفت شروع کر دی۔ حکومت نے جوزف کو معاشرے میں انتشار پھیلانے کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ عدالت نے اسے بری کر دیا۔ انہی دنوں ریاست اوہائیو کے ایک قصبے کرٹ لینڈ کے چرچ کا پادری سڈنی رگدن اپنے ایک سو ساتھیوں کے ساتھ جوزف نبی پر ایمان لے آیا۔ جوزف کو وحی آئی کہ وہ

From left to right Birgham Young, Emma Hale Smith (Joseph Smith's wife) Sidney Rigdon, Oliver Cowdery, and Joseph Smith

اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیویارک سے ہجرت کر کے کرٹ لینڈ چلا جائے۔ جوزف اور اس کے ساتھیوں نے خدائی حکم کی تعمیل کی اور کرٹ لینڈ ہجرت کر گئے۔ ایک اور وحی کے ذریعے جوزف کو علم ہوا کہ خدا نے جس بہشت میں آدم اور حوا کو رکھا تھا وہ امریکی ریاست میسوری کی جیکسن کاؤنٹی کے قصبے آزادی میں تھی۔ جوزف کے کچھ پیروکار آزادی میں آباد ہو گئے۔ جوزف بھی 1831ء میں کچھ ساتھیوں کے ساتھ قصبے آزادی گیا اور اپنے پیروکاروں کو بتایا کہ خدا نے اسے وحی کی ہے کہ یہاں نیا یروشلم بسایا جائے۔ اس نے وہاں نئے چرچ کی بنیاد رکھ دی۔ اس چرچ کے 800 ممبر تھے۔ جوزف نے اپنا ہیڈ کوارٹر کرٹ لینڈ میں ہی رہنے دیا۔ اگلے چھ سال جوزف نے کرٹ لینڈ میں گزارے۔ اس دوران اس پر مسلسل وحی نازل ہوتی رہی۔ ان وحیوں کا زیادہ تر تعلق چرچ کی تعمیر و تنظیم سے تھا۔ انہی دنوں کرٹ لینڈ میں مورمن چرچ تعمیر ہوا۔ نیز جوزف پر نازل ہونے والی وحی کی پہلی کتاب "احکامات کی کتاب" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ چند سال بعد جوزف نے وحیوں کی دوسری کتاب اور اپنے خطبات کی کتاب بھی شائع کر دی۔ ادھر میسوری میں عیسائیوں نے مورمنوں پر حملے کر کے ان کی املاک تباہ کر دیں۔ مورمن جیکسن کاؤنٹی چھوڑ کر کلے کاؤنٹی چلے گئے۔ عیسائیوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ان عیسائیوں کے نزدیک مورمن نبی جھوٹا تھا اور اس کے پیروکار مرتد اور زندیق۔ مورمنوں کو کلے کاؤنٹی سے بھی بھاگنا پڑا اور وہ میسوری ریاست کے شمال میں دو سرحدی کاؤنٹیوں کالڈ ویل اور ڈیوس میں آباد ہو گئے۔ دو سال بعد 1838ء میں جوزف سمتھ بھی کرٹ لینڈ چھوڑ کر میسوری آ گیا۔ دوسرے مورمن بھی اس کے پیچھے پیچھے میسوری پہنچ گئے۔ جوزف نے وہاں نئے چرچ کی بنیاد رکھی اور کئی پرانے ساتھیوں کو چرچ سے نکال دیا۔ ان میں اس کا قریبی دوست اولیور کاؤدری بھی شامل تھا۔ کاؤدری نے جوزف پر زنا کاری کا الزام لگایا تھا۔ مقامی عیسائیوں کے ساتھ چپقلش اور جھڑپیں جاری رہیں۔ مورمنوں نے بھی اپنے دفاع کے لئے ملیشیا کی طرز پر مسلح جتھے بنانا شروع کر دیئے۔ الیکشن کا موقع آیا تو عیسائیوں نے مورمنوں کو ووٹ ڈالنے سے جبراً روکنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں دونوں گروہوں میں خونریز تصادم ہو گیا۔ نیز مورمن ملیشیا نے سرکاری ملیشیا کو عیسائیوں کی پرائیویٹ ملیشیا سمجھ کر اس پر حملہ کر دیا۔

سرکاری ملیشیا پر حملے نے میسوری کے گورنر کو مورمنوں کے خلاف بھڑکا دیا۔ اس نے مورمنوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے یا ریاست سے بھگا دینے کے احکامات جاری کر دیئے۔ گورنر کا حکم ملتے ہیں مورمن مخالف عیسائیوں نے مورمنوں کو پکڑ پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ وہ بچوں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ جوزف گرفتار ہوا اور عدالت نے اسے بغاوت کے الزام میں سزائے موت سنا دی۔ جس افسر نے سزائے موت پر عمل درآمد کرنا تھا اس نے جوزف کو جیل ہی میں رہنے دیا۔ بریگم ینگ کی قیادت میں بچے کھچے مورمن ریاست النوائے چلے گئے۔ خوش قسمتی سے النوائے کے عیسائیوں نے انھیں بے ضرر سمجھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ پانچ ماہ بعد جوزف بھی جیل سے فرار ہو کر النوائے پہنچ گیا اور اس نے دریائے مسیسپی کے کنارے ایک نئے شہر نوو کی بنیاد رکھ دی۔ نوو شہر آباد کرنے کے بعد جوزف سمتھ نے واشنگٹن جا کر صدر مارٹن وان برن سے ملاقات کی اور مطالبہ کیا کہ حکومت میسوری میں مورمنوں کے جانی اور مالی نقصانات کا ازالہ کرے۔ صدر مارٹن نے مورمنوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر اظہار افسوس کیا لیکن نقصانات کی تلافی کرنے سے معذرت کر لی۔ مورمنوں کو ہوم رول اور اپنی ملیشیا رکھنے کی اجازت 1840ء میں ملی۔ جوزف نوو شہر کا پہلا میئر اور مورمن ملیشیا کا ملٹری لیڈر بن گیا۔ امریکہ کے دوسرے حصوں اور یورپ سے آنے والے نئے مورمنوں کی آمد سے نوو کی آبادی تیزی سے بڑھی اور تقریباً "شکاگو کے برابر ہو گئی۔ یہاں آنے والے ہر مورمن کو رہائش کے لئے گھر اور کاشتکاری کے لئے زمین مورمن چرچ کی طرف سے مفت ملتی تھی۔

تین سال بعد 1843ء میں جوزف کو وحی کے ذریعے دو نئے احکامات ملے۔ ان احکامات کا تعلق مردوں کو بپتسمہ دینے یعنی دین عیسوی میں لانے اور کثیر ازدواجی کی اجازت ملنے سے تھا۔ بعض حالات میں کثیر ازدواجی کے حکم پر عمل مورمن مردوں پر فرض تھا۔ اس وحی نے مورمنوں میں اختلافات پیدا کر دیئے۔ بریگم ینگ اور جوزف کی بیوی امہ ہیل کثیر ازدواجی کے مخالف تھے۔ وحی میں امہ ہیل کو خاص طور پر مخاطب کیا گیا

Left to right, Salt Lake City, San Diego, & Washington DC temples.

تھا کہ وہ اس حکم کی تعمیل وحمایت کرے۔ کثیر ازدواجی سے متعلق اس وحی کو دس سال تک عام مورمنوں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ کچھ عرصے بعد بریگم ینگ نے کثیر ازدواجی کا حکم نہ صرف مان لیا بلکہ اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ اس کے بیس بیویوں سے 57 بچے ہوئے۔ اب مورمن چرچ کے رہنما اعتراف کر چکے ہیں کہ جوزف نبی کی چالیس بیویاں تھیں اور ان میں کم از کم دس بیویاں اٹھارہ سال سے کم عمر کی تھیں۔ مورخین کی رائے ہے کہ جوزف کی بیویوں کی تعداد پچاس سے زیادہ تھی۔ امہ ہیل مرتے دم تک کثیر ازدواجی کی مخالف رہی۔ نیز وہ اپنے بچوں کو بھی یہی بتاتی تھی کہ جوزف کی کوئی دوسری بیوی نہیں تھی۔ سنہ 1844 میں جوزف سمتھ نے امریکی صدارتی انتخاب کی دوڑ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ نیز اس نے ایک مخالف اخبار Nauvoo Expositor اور اس کے پریس کو تباہ کر دینے کا حکم دے دیا۔ یہ اخبار جوزف سمتھ کے نئے مذہبی عقائد خصوصاً "کثیر ازدواجی پر تنقید کرتا تھا۔ حکومت نے جوزف اور اس کے بھائی حیرم کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ مورمن مخالف ہجوم نے جیل پر حملہ کر کے دونوں بھائیوں کو قتل کر دیا۔ جوزف نبی کے قتل کے بعد مورمن رہنماؤں میں اس کی جانشینی اور مورمن چرچ کی قیادت کے لئے رسہ کشی شروع ہوگئی۔ جوزف کے چھوٹے بھائیوں اور بیٹوں کے علاوہ اس کے قریبی ساتھی بھی امیدوار تھے۔ اگر اولیور کاؤدری کو چند سال قبل چرچ سے نکال نہ دیا جاتا تو اس کے جوزف کا جانشین بننے کے امکانات زیادہ تھے کیونکہ وہ نئے مذہب کے آغاز ہی سے جوزف کا پر اعتماد ساتھی اور اس کا نائب رہ چکا تھا۔ قصہ مختصر مورمن کئی دھڑوں میں بٹ گئے۔ ایک دھڑا جیمز سٹرینگ کی قیادت میں ریاست مشیگن کی طرف نکل گیا اور دوسرے دھڑے کو سڈنی رگدن مڈویسٹ کی طرف لے گیا۔ جو مورمن باقی بچے وہ بارہ حواریوں کے کورم کے سربراہ بریگم ینگ کی رہنمائی میں طویل سفر کر کے امریکہ کی حدود سے باہر سالٹ لیک کے پہاڑی علاقے میں آباد ہو گئے۔ یہ علاقہ یوٹاہ میں تھا۔ میکسیکو کی شکست کے بعد ایک معاہدے کے تحت یوٹاہ سمیت میکسیکو کا مغربی حصہ امریکہ کو مل گیا۔ آہستہ آہستہ دوسرے علاقوں کے مورمن ہجرت کر کے سالٹ لیک کے علاقے میں آباد ہونا شروع ہو گئے۔ انہوں نے یوٹاہ میں جو نئے قصبے اور شہر بسائے ان میں سب سے اہم سالٹ لیک سٹی ہے۔ 1850ء میں بریگم ینگ یوٹاہ کا گورنر بن گیا۔ دو سال بعد چرچ کے رہنماؤں نے عام مورمنوں کو بھی کثیر ازدواجی کے خدائی حکم سے آگاہ کر دیا۔ اس اعلان سے مورمنوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ جن مورمنوں نے اس خدائی حکم اور بریگم ینگ کی قیادت کو ماننے سے انکار کر دیا وہ ریاست وسکونسن میں جمع ہوئے اور اپنے الگ چرچ کی بنیاد رکھ دی۔ ان کا ایمان تھا کہ جوزف نبی کی اولاد کے علاوہ کسی کو چرچ کی سربراہی کا حق حاصل نہیں۔

برسوں بعد جوزف سمتھ سوم نے اس نئے چرچ کی صدارت قبول کر لی اور چرچ کا ہیڈ کوارٹر ریاست میسوری کے شہر آزادی میں منتقل کر دیا۔ اس صدی کے آغاز میں مورمنوں کے اس فرقے نے اپنا نام کمیونٹی آف کرائسٹ یعنی عیسیٰ یا مسیح کی جماعت رکھ لیا۔ ادھر یوٹاہ کے مورمنوں نے پڑوسی ریاستوں مثلاً کیلی فورنیا، نویڈا، اور وائیومی میں بھی نئی بستیاں اور شہر بسا دیئے۔ نویڈا کا مشہور شہر لاس ویگاس بھی مورمنوں کا بسایا ہوا ہے۔ نئے امریکی صدر جیمز بیوکانن (1857-1861ء) کو پتہ چلا بریگم ینگ نے یوٹاہ میں تھیوکریسی (مذہبی حکومت) قائم کی ہوئی ہے تو اس نے اسے وفاقی حکومت کے خلاف بغاوت قرار دیا۔ نیز اس مذہبی حکومت کو ختم کرنے کے لئے وفاق نے اڑھائی ہزار فوجی بھیج دیئے۔ مورمنوں نے فوجیوں کی مزاحمت تو نہ کی البتہ ان کی سپلائی ٹرینوں کو ہراساں کرنا شروع کر دیا۔ وفاقی حکومت نے یوٹاہ کا کنٹرول سنبھال کر نیا گورنر مقرر کر دیا۔ اس دوران ماؤنٹین میڈو یعنی پہاڑی چراگاہ کے قتل عام کا واقعہ پیش آیا۔

مورمن لیڈر جان لی کی قیادت میں کچھ مورمنوں نے قدیم امریکی باشندوں کے ساتھ مل کر ریاست آرکنساس سے آنے والے آبادکاروں کی ویگن ٹرین پر حملہ کر کے ۱۲۰ مردوں، عورتوں، اور بچوں کو قتل کر دیا۔ صرف سترہ بچے جن کی عمریں سات سال سے کم تھیں زندہ رہنے دیئے۔ کیا اس قتل عام کی منظوری بریگم ینگ نے دی تھی؟ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بریگم ینگ نے اس واقعے کو چھپانے کی پوری کوشش کی۔ جان لی گرفتار ہوا اور عدالت سے سزائے موت ملنے کے بعد اسے فائرنگ اسکواڈ نے گولی مار دی۔ انیسویں صدی کے آخر میں مورمنوں کی تعداد ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں تک پہنچ گئی۔ مورمن چرچ کے صدر ولفورڈ ووڈرف نے کثیر ازدواجی کے حکم سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ 1896ء میں یوٹاہ کو ریاست کا درجہ مل گیا۔ 1904ء میں مورمن چرچ نے وفاقی حکومت سے تعاون کرنے کا اعلان کر کے کثیر ازدواج ممبروں کو چرچ سے نکال دیا۔ جوزف سمتھ کی تعلیم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ اس کی تعلیم برائے نام تھی۔ یہ امکان بھی موجود ہے کہ خاندان کی ابتر معاشی حالت کی وجہ سے وہ بچپن ہی سے باپ کا ہاتھ بٹاتا رہا اور کبھی سکول نہیں گیا۔ اس کی بیوی کا ایک بیان موجود ہے جس کے مطابق جوزف سمتھ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اس نے یہ بیان غالباً "اس الزام یا تاثر کو رد کرنے کے لئے دیا تھا کہ مورمن کی کتاب کا مصنف جوزف سمتھ خود تھا۔ مقام حیرت ہے کہ اس ان پڑھ "نبی" نے 22 سال کی عمر (جب اس نے مورمن کی کتاب لکھنا شروع کی) سے 39 سال کی عمر (جب مشتعل ہجوم نے اسے قتل کر دیا) تک صرف 18 سال کے مختصر عرصے میں ہزاروں صفحات پر مشتمل وحی، ترجمے، خط وکتابت، بیانات وخطبات، رسائل وجرائد، اور سرگزشتیں لکھ ڈالیں۔ اگر جوزف سمتھ کی لکھی ہوئی

تحریروں کو کتابی شکل دی جائے تو کم از کم تیس جلدیں بن جائیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جوزف سمتھ جونیئر دیکھتے ہی دیکھتے گوشہ گمنامی سے نکل کر ایک عالم دین، خدا کا نبی، عیسائیوں کے ایک نئے چرچ کا بانی اور رہنما، اور امریکہ میں کئی نئے شہروں کی بنیاد رکھنے والا بن گیا۔ جوزف سمتھ اپنی بے مثال کامیابی کا کریڈٹ وحی یا الہام یعنی خدا سے براہ راست رہنمائی کو دیتا تھا۔ اس کے پیروکار بھی یہی سمجھتے تھے کہ وحی کی سچائی اور تاثیر ہزاروں افراد کو کھینچ کر مورمن چرچ لے آئی۔ جوزف سمتھ کی موت کے بعد مورمنوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے لاکھوں اور کروڑوں تک پہنچ گئی۔ اس صدی میں مورمن دنیا بھر میں اپنی تعداد ایک کروڑ پچاس لاکھ بتاتے ہیں۔ مورمن چرچ نے اسٹاک مارکیٹ میں 40 بلین ڈالر لگا رکھے ہیں۔ اسٹاک مارکیٹ اور دوسرے اثاثوں سے مورمن چرچ کو سالانہ پندرہ ارب ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے۔ ہر مورمن اپنی آمدنی کا دسواں حصہ چرچ کو دینے کا پابند ہے۔ اس مد میں چرچ کو سالانہ 8 بلین ڈالر ملتے ہیں۔ چند روز قبل واشنگٹن پوسٹ نے انکشاف کیا کہ مورمن چرچ کا سربراہ 100 ارب ڈالر کا مالک ہے۔ یہ رقم فلاحی کاموں پر خرچ ہونا تھی لیکن نہیں کی گئی۔ اگلی قسط میں ہم مورمن کی کتاب اور جوزف کی بائبل کا تنقیدی جائزہ لیں گے۔ مورمنوں کا ایمان ہے کہ یہ دونوں مقدس کتابیں آسمانی ہیں اور ان کا ایک ایک حرف سچا ہے۔ تیسری اور آخری قسط میں مورمن فرقے کی کثیر ازدواجی کے معاملے پر بحث ہو گی۔ دوسری قسط میں آپ کو ان سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔

کیا مورمن کی کتاب وحی یا الہام ہے؟

کیا یہ کتاب آج بھی ویسی ہی ہے جیسی یہ پہلی مرتبہ 1830ء میں شائع ہوئی یا اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں؟

کیا جوزف سمتھ کی بائبل آسمانوں سے نازل ہوئی تھی؟ کیا یہ کتاب بائبل کے باقی نسخوں میں پائی جانے والی غلطیوں سے پاک ہے؟

کیا تاریخ، جغرافیہ، آثار قدیمہ، اور سائنس مورمن کتاب میں درج مقامات، واقعات، اور دعووں کی تصدیق کرتے ہیں؟

کیا عیسیٰ علیہ السلام نیفی اور لامن قبیلوں میں صلح کرانے کے لئے اپنی وفات کے کئی سو سال بعد امریکہ تشریف لائے تھے؟

کیا امریکہ کے قدیم باشندے اسرائیلی نبی لحی کی اولاد ہیں؟ ڈی این اے کی شہادت مورمن کتاب کے اس دعوے کی تصدیق کرتی ہے یا تردید؟

کیا نیویارک کی کمورا پہاڑی میں وہ غار موجود ہے جہاں جوزف سمتھ کی ملاقات خدا اور عیسیٰ علیہ السلام سے ہوئی تھی؟

کیا ماہرین آثار قدیمہ کو کمورا پہاڑی پر ہونے والی خوفناک جنگ کے آثار مل گئے؟

مورمن کی کتاب کے مطابق اس جنگ میں کوئی دو اڑھائی لاکھ نیفی جو کہ خدا پر ایمان رکھتے تھے مارے گئے اور امریکہ میں ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ مقتولین میں نیفیوں کا نبی مورمن بھی شامل تھا۔ صرف مورمن کا بیٹا مرونی اپنے باپ کی کتاب "مورمن کی کتاب" کو مکمل اور محفوظ کرنے کے لئے زندہ رہا۔ اس جنگ کے فاتح خدا کے منکر لامن تھے۔ خدا نے نیفیوں کا بدلہ لینے کے لئے لامنوں کی جلد کا رنگ سفید سے سیاہ کر دیا۔

میں ایک گزشتہ مضمون میں مورمن کی کتاب کا تعارف پیش کر چکا ہوں۔ آپ اس مضمون کی نیچے دیئے گئے لنک پر کلک کر کے پڑھ سکتے ہیں۔

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ۔

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

Lahore International Magazine

@lahoreintl
@lahoreintl
lahoreinternational
lahoreinternational
lahoreintl
+447940077825
+447940077825
lahoreintlondon@gmail.com

برطانیہ سابق سیاستدان کی جانب سے لوٹے گئے 58 لاکھ ڈالر نائیجیریا کو واپس کرے گا

برطانیہ اور نائیجیریا کے درمیان حال ہی میں طے پانے والے ایک معاہدے میں برطانیہ نے نائیجیریا کو اس کے ایک سابق گورنر کی جانب سے لوٹے ہوئے 58 لاکھ ڈالر (42 لاکھ پاؤنڈ) جلد لوٹانے کی یقین دہانی کرائی ہے۔ یہ سابق گورنر ڈیلٹا سٹیٹ جیمز ایبوری ہیں جو برطانیہ میں منی لانڈرنگ کے جرم میں سنہ 2012 میں سزا پا چکے ہیں۔ وکلا کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے تیل کے ذخائر سے مالا مال ریاست سے تقریباً 11 کروڑ 70 لاکھ پاؤنڈ لوٹے تھے۔ برطانوی حکام کے مطابق یہ سنہ 2016 میں دونوں ممالک کے درمیان ہونے والے معاہدے کے بعد سے پہلا موقع ہے جب مجرموں سے رقم لے کر نائیجیریا کو واپس کی جا رہی ہے۔ برطانیہ اور نائیجیریا کی حکومتوں کے درمیان منگل کے روز ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے تحت برطانوی ایجنسیز کی جانب سے ضبط کیے گئے 42 لاکھ پاؤنڈ جلد نائیجیریا میں تعمیر ہونے والے نئے منصوبوں میں استعمال کیے جا سکیں گے۔ ان منصوبوں میں لاگوس سے ابادان ایکسپریس وے، ابوجا سے کانو روڈ اور دوسرا نائیجر پل شامل ہے۔

جیمز ایبوری کون ہیں؟

جیمز ایبوری چھوٹے پیمانے پر چوریاں کرتے کرتے نائیجیریا کی ایک ریاست کے گورنر بنے اور پھر منی لانڈرنگ کرنے کے جرم میں برطانیہ میں قید میں رہے۔ وہ سنہ 1980 میں برطانیہ گئے اور لندن میں ایک سٹور پر بطور کیشیئر کام کرنے لگے۔ ایبوری کو 1991ء میں سٹور سے چوری کرنے پر سزا ہوئی تاہم اس کے بعد وہ نائیجیریا لوٹ آئے اور سیاست میں دلچسپی لینے لگے۔ جب وہ ڈیلٹا سٹیٹ کے لیے گورنر کے امیدوار کے لیے کھڑے ہوئے تو انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش غلط بتائی تاکہ وہ برطانیہ میں ملنے والی سزا کو چھپا سکیں کیونکہ یہ ان کے اور اس عہدے کے درمیان رکاوٹ بن سکتی تھی۔ وہ 1999ء میں گورنر بنے اور جلد ہی ریاست کے خزانے سے رقم لوٹنے لگے۔ خیال رہے کہ نائیجیریا کے تیل کے ذخیرے کا ایک بڑا حصہ ڈیلٹا سٹیٹ میں موجود ہے۔

برطانوی حکام نے اب انھیں سزا کیوں دی؟

برطانوی پولیس نے ایبوری کے لندن میں موجود وکیل کے ذریعے ایک نجی طیارے کی خریداری کا آرڈر دیکھنے کے بعد سے ایبوری کے معاملات میں سنہ 2005 میں دوبارہ دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔

تاہم ان کے درمیان آنکھ مچولی کا کھیل کافی عرصہ چلتا رہا۔ وہ نائیجیریا میں پولیس کی جانب سے حراست میں لیے جانے کے عمل سے اس وقت بال بال بچے جب ان کے حامیوں نے پولیس پر حملہ کر دیا لیکن انھیں سنہ 2010 میں آخر کار دبئی میں گرفتار کر لیا گیا جس کے بعد انھیں برطانیہ منتقل کر دیا گیا۔ سنہ 2012 میں ان پر پانچ کروڑ پاؤنڈ مالیت کے فراڈ کے 10 مختلف الزامات ثابت ہونے کے بعد انھیں سزا سنائی گئی تھی۔ سنہ 2016 میں رہائی کے بعد انھیں فوری طور پر امیگریشن حراست میں رکھا گیا تھا۔ عدالت کے فیصلے سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی دفترِ داخلہ نے ایک ای میل کے ذریعے تجویز دی تھی کہ انھیں حراست میں رکھنے سے ان سے کم از کم پانچ کروڑ 70 لاکھ پاؤنڈ واپس لینے کا وقت مل جائے گا۔ جب انھیں بالآخر رہا کیا گیا تو وہ نائیجیریا لوٹ آئے اور انھوں نے برطانوی دفترِ داخلہ پر انھیں غیر قانونی طور پر حراست میں رکھنے کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس مقدمے کا فیصلہ ایبوری کے حق میں آیا لیکن انھیں ہرجانے کی مد میں صرف ایک پاؤنڈ دیا گیا۔ سنہ 2020 میں برطانوی عدالت میں وکلا نے جج سے ایبوری سے لگ بھگ 11 کروڑ 70 لاکھ پاؤنڈ ضبط کرنے کا حکمنامہ جاری کرنے کی استدعا کی تھی۔ عدالت میں جمع کروائے گئے دستاویزات میں ایبوری کے نام کے متعدد بینک اکاؤنٹس بھی ہیں اور دنیا بھر میں ان کی دس جائیدادوں کا بھی ذکر ہے۔ جن میں لندن کے مشہور ایبے روڈ پر فلیٹس اور نائیجیریا کے دارالحکومت ابوجا میں 50 لاکھ پاؤنڈ مالیت کی کوٹھی موجود ہے۔ دستاویزات کے مطابق ان کے اثاثوں میں ایک بینٹلی گاڑی اور ایک بومبارڈیئر چیلنجر جیٹ بھی شامل ہے جس کی مالیت ایک کروڑ 70 لاکھ پاؤنڈ کے قریب ہے۔

عدالت نے تاحال اس ضمن میں فیصلہ نہیں دیا ہے۔

کیمیائی ہتھیاروں کی اقسام

تحریر: نوتک بلوچ

ایک ایسا آلہ ہے جو کیمیائی ترکیب سے تشکیل دے کر انسانوں کو مارنے یا ہمیشہ کے لیے معذور بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حالیہ واقعہ کے پیش نظر جس میں شامی حکومت نے کیمیائی ہتھیار استعمال کر کے بہت سارے انسانوں کو قتل کیا ہے بلکہ اس جیسے دوسرے ممالک کو بھی حیران کیا ہے۔ کیمیائی ہتھیار بہت سارے دوسرے ہتھیاروں کی نسبت زیادہ خطرناک اور اذیت ناک موت کا سبب بنتے ہیں۔ حیاتیاتی ہتھیار اور کیمیائی ہتھیار دونوں ہی بہت خطرناک ہیں۔ ان ہتھیاروں کے لیے ایک اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ انبوہ تباہی ہتھیار (ویپن آف ماس ڈسٹریکشن) سے مراد ایسے ہتھیار ہیں جو لوگوں کی کثیر تعداد کو مار سکتا ہو اور ان کو خطیر ضرر پہنچا سکتا ہو۔ اس کے علاوہ انسان کی بنائی عمارتوں اور دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ کرہ ارض کو نقصان پہنچا سکتے ہوں۔ جدید دور میں انسان نے اپنے دشمن کو تلف کرنے کے لیے جدید اسلحہ تیار کر لیا ہے کہیں پر انسانی طرز کے روبوٹ جنگ لڑنے کے لیے تیار ہیں اور کہیں پر جان لیوا بیماریوں کے جراثیم سے جنگ کے لیے تیاریاں ہو رہی ہیں اسی میں سے ایک نروگیس ہے جو کہ کیمیائی ہتھیاروں میں شامل ہے۔ کیمیائی ہتھیاروں کی ایک لمبی تعداد ہے جن میں سے انسانی جسم پر اثر انداز ہونے کے اعتبار سے ذکر کیا جائے گا۔ سب سے پہلے وہ کیمیکل جو انسانی اعصاب پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسان کو حرکت کرنے سوچنے اور کسی بھی اعصابی عمل سے روک کر کچھ ہی وقت میں موت کا باعث بنتے ہیں۔

1۔ سیرین: یہ بے رنگ اور بے بو مائع ہے یہ نروایجنٹ بھی کہلاتا ہے اور اس کو اقوام متحدہ کی طرف سے عوام الناس کی موت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اس کا سب سے پہلے استعمال 1950ء میں ہوا اور آخری دفعہ 2013ء میں ممکنہ طور پر خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ شامیوں نے یہ کیمیکل استعمال کیا ہے۔ یہ سائینائڈ سے بھی پانچ سو گنا زیادہ خطرناک ہے۔ اور اس کا اثر سب سے پہلے ناک بہنا، سینے میں جکڑن، آنکھ کی پتلیوں کا سکڑنا، سانس کا رکنا، متلی، اور قے کے ساتھ ہی جسم رک جاتا ہے جس کے ساتھ جھٹکے لگتے ہیں تھوڑی دیر بعد موت کا سبب بن جاتا ہے۔

2۔ سومان: یہ کیمیکل بھی بہت زہریلا ہے اور عمل کے لحاظ سے سیرین کی طرح ہی ایسی ٹائل کولین ایسٹریز انزیم پر عمل کرتا ہے۔ اس کو بھی نروایجنٹ ہی کہتے ہیں۔ اس کو جنگ عظیم اول میں استعمال کیا گیا۔

3۔ سائیکلوسیرین: یہ کیمیائی ہتھیار سب سے پہلے جرمنی نے جنگ عظیم دوم میں تیار کیے تھے یہ نروایجنٹ کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ یہ ایسے ہتھیار ہیں جو انسانی اعصابی نظام پر اثر کرتے ہیں۔

4۔ تابون: یہ شفاف، بے رنگ، بے ذائقہ مائع ہے جس کی پھلوں جیسی خوشبو ہے۔ یہ بھی اعصابی نظام پر اثر انداز ہو کر اسے مفلوج بنا دیتا ہے۔ اوپر درج تمام کیمیکل اور تابوں کو جی سیریز کیمیکل کہا جاتا ہے جو انتہائی زہریلے ہیں۔ اس کو حادثاتی طور پر جرمنوں نے 1936ء میں دریافت کیا تھا۔ دوسرے نمبر پر ہم جلد کو جلا دینے والے کیمیکل کا ذکر کریں گے جن کو بلسٹرینگ ایجنٹ کہتے ہیں۔ یہ کیمیائی ہتھیار جنگوں میں مخالف فوج کو جلانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور اس سے انسانی جلد کو جلا کر بھسم کر دیتے ہیں۔

مسٹرڈ گیس: مسٹرڈ گیس کاربن، ہائیڈرجن، سلفر اور کلورین کا مرکب ہے۔ یہ بے رنگ گاڑھا مائع ہے جو زرد سے بھورے رنگ کا ہوتا ہے اور بوسرسوں اور لہسن کے پودے سے ملتی ہے۔ اس کو بھی جرمن آرمی نے 1916ء میں ہی بنایا تھا۔ اس کے اثرات میں سب سے اہم جلد کا جل جانا اور اس میں زرد رنگ کا پانی بھر جانا ہے جو سلفر ہی ہوتا ہے اس کے علاوہ نظام تنفس پر بھی اس کا بہت خطرناک اثر ہے۔ صدام حسین نے اس کو استعمال کر کے 4000 کے قریب کرد مار دیے تھے۔ اس کے علاوہ اسرائیل نے مصری افواج کے خلاف ہونے والی دونوں بڑی جنگوں میں اِن بھیانک کیمیائی ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال کیا۔ تیسرے نمبر پر نظام تنفس پر اثر کرنے والے ہتھیار شامل ہیں۔

کیمیائی ہتھیاروں کی ایک اور بھیانک قسم سانس روک کر انتہائی دردناک موت سے دوچار کرنے والے کیمیکلز کلورین اور فاسجین وغیرہ شامل ہیں۔ ان کیمیائی ہتھیاروں کا شکار بننے والے کی سانس کی نالی بند ہو جاتی ہے اور دم گھٹنے سے وہ انتہائی بھیانک موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے کیمیائی ہتھیار بھی ہیں جن کے شکار افراد پر ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں جیسے لقوے/ فالج کا شکار ہو گئے ہوں۔ اچھا خاصا تندرست انسان اِن ہتھیاروں کے اثر کی وجہ سے کوئی بھی حرکت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ ایسے کیمیائی ہتھیاروں کو دہشت گردوں پر قابو پانے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک کیمیائی ہتھیار ایسا بھی ہے۔ جس کا شکار انسان الٹیاں کر کر کے نڈھال ہو جاتا ہے اور موت واقع ہو جاتی ہے۔ ان کے علاوہ بہت سارے زہریلے مادے استعمال کیے جا سکتے ہیں جن میں سے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس استعمال کی جاتی ہے۔ اس مضمون کا مقصد ہتھیاروں سے آگہی ہے جس کا شکار پوری دنیا کے انسان ہو رہے ہیں۔ ویسے تو ہتھیاروں کی بہت ساری قسمیں ہیں لیکن کیمیائی ہتھیار سب سے زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔

بھارتی مسلمانوں کی سیاسی ناکامی

تحریر: شہریار شوکت

بھارت کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت تصور کیا جاتا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوری قوت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ تو کہتی ہے لیکن آج تک کشمیر اور کشمیریوں کو ان کے جمہوری حقوق دینے سے انکاری ہے۔ مودی جی کی بی جے پی نے انتخابات 2019 میں کامیابی حاصل کی اور اس کامیابی کی مبارکباد کشمیریوں کو حریت رہنما موسیٰ ذاکر کی شہادت کی صورت میں دی۔ بی جے پی 1980 میں قائم ہوئی۔ یہ سیاسی جماعت نام نہاد سیکولر بھارت کے چہرے سے نقاب ہٹا دیتی ہے۔ بھارت جہاں کسی وقت میں کانگریس سب سے بڑی جماعت تصور کی جاتی تھی اب وہاں کی سب سے بڑی جماعت بی جے پی ہے۔ بی جے پی متعصب ہندوؤں کا ایک گروہ ہے جس کا نظریہ INDIA FOR HINDUS ہے۔

بابری مسجد کی شہادت ہو یا ہندوستان میں مسلمانوں کا قتل عام اور مسلمانوں پر ظلم وستم بی جے پی کا نام ہمیشہ سرفہرست رہا ہے۔ مودی جی کی انتخابات میں کامیابی پر جہاں کانگریس کے رہنما راہول گاندھی نے انہیں مبارک باد دی ہے اور اپنی شکست تسلیم کی وہیں پاکستان کے کپتان جی عمران خان نے بھی انہیں مبارکباد دی۔ اس مبارک باد کا مقصد شاید یہ تھا کہ بھارت کو مثبت پیغام دیا جائے کہ پاکستان بھارت سے اچھے تعلقات چاہتا ہے۔ یہ ایک اچھا اقدام تھا لیکن بھارتی میڈیا کے مطابق مودی جی کی تقریب حلف برداری میں عمران خان کو دعوت نہیں دی جائے گی، اب خدا جانے بھارت کیا چاہتا ہے؟ خیر یہ ایک الگ بحث ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کے لئے جہاں بی جے پی کی کامیابی اچھا شگن نہیں ہے وہیں پریشان کن بات یہ ہے کہ بھارتی ایوانوں میں مسلمانوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ 542 نشستوں میں سے صرف 22 پر مسلمان براجمان ہوں گے۔ مسلمان بھارت کی دوسری بڑی قوم ہے۔ بھارت کی کل آبادی کا تقریباً 18 فیصد مسلمان ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ بھارتی مسلمان اتحاد کے بجائے دیگر مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ بھارت کی سیاسی جماعتوں نے شعوری طور پر مسلمانوں کو مذہبی سوالوں میں الجھائے رکھا ہے۔ کبھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کریکٹر، کبھی شاہ بانو کیس، کبھی تین طلاق تو کبھی اردو کو سیکنڈ زبان کا درجہ دینے کی باتیں۔ چالیس برس سے سیاسی جماعتیں مسلمانوں کو انھیں سوالوں میں الجھائے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کو ایک مذہبی فریم میں قید کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ ماضی میں کانگریس، سماجوادی، بہوجن سماج پارٹی اور دوسری جماعتیں بی جے پی کا خوف دلا کر مسلمانوں کا ووٹ حاصل کرتی رہی ہیں جبکہ اقتدار میں آنے والی مسلم مخالف جماعت بی جے پی نے بھی مسلمانوں کو برائے نام نمائندگی دے رکھی ہے۔ دوسری جانب کل ہند مجلس اتحاد المسلمین یا جمیعت علمائے ہند جیسی مسلم جماعتیں بھارتی سیاست میں ناکام اور محدود ہی نظر آتی ہیں۔ مسلمانوں کی بھارتی ایوانوں میں نمائندگی میں دن بدن کمی کی وجہ بھارتی مسلمانوں کی تقسیم ہے۔ کہیں کانگریس مسلمانوں کو بی جے پی سے ڈراتی ہے اور انہیں یہ یقین دلاتی ہے کہ کانگریس ہی مسلمانوں کی نمائندگی کرے گی اور انہیں برابری کے حقوق دلائے گی تو دوسری جانب بی جے پی اپنے کئے پر مسلمانوں سے معافی مانگ کر انہیں یہ احساس دلاتی ہے کہ بی جے پی ایک طاقتور جماعت ہے اگر مسلمان اس کا ساتھ دیں تو ان کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ مجلس اتحاد المسلمین کانگریسی اور بی جے پی کے مسلمان رہنماؤں کی مخالفت کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ پاتیں اور جمیعت بھی ایک مخصوص طبقے تک ہی محدود ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ آج بھی بھارت میں وہی ہو رہا ہے جو تقسیم ہند کے وقت ہوا۔ تب انگریزوں نے Divide and Rule کا فارمولا اپنا کر ہندوستان پر حکومت کی اور آج ہندو اس فارمولے کی مدد سے مسلمانوں پر حکومت کر رہے ہیں اور انہیں مسلسل دبا رہے ہیں۔ کبھی مسلمان گائے کا گوشت کھانے پر قتل کر دیا جاتا ہے تو کبھی جے ہند کا نعرہ نہ لگانے پر۔ کبھی بابری مسجد شہید کر کے معافی کا لالی پاپ دے کر مسلمانوں سے ووٹ لیا جاتا ہے تو کبھی دوسری سیاسی جماعت کا خوف دلا کر۔ تقسیم ہند کے وقت مولانا آزاد کی نیک نیتی پر شک نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اس وقت بھی کانگریس نے انہیں استعمال کیا اور محمد علی جناح کو ناکام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پاکستان کے مخالف کسی حد تک اس کوشش میں کامیاب ہوئے اور پاکستان ایک بڑا اور مستحکم پاکستان نہ بن سکا۔ محمد علی جناحؒ کی بہترین سیاسی بصیرت ہی تھی کہ آج پاکستان کے مسلمان بھارت کے مسلمانوں سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔ بھارتی مسلمان رہنماؤں کو تقسیم ہند میں اپنے بڑوں کی ناکامیوں کو یاد کرنا ہوگا اور بھارتی ہندوؤں کی سازشوں کو سمجھنا ہوگا۔ مسلمان رہنماؤں کو مختلف سیاسی جماعتوں میں بٹنے کے بجائے اپنے میں سے ایک قائد کا انتخاب کرنا ہوگا اور تمام جماعتوں سے وابستہ مسلمانوں کو اس کی سرپرستی میں ایک ہونا ہوگا۔ جو ہونا تھا ہو گیا لیکن بی جے پی کی 5 سالہ حکومت میں مسلمانوں کو مسلم سیاسی اتحاد بنا کر آئندہ انتخابات کی بھرپور تیاری کرنا ہوگی اگر ایسا نہ کیا گیا تو بھارت کے مسلمان مزید پستی کا شکار ہوں گے۔

جنگ آزادی مئی ۱۸۵۷ء اور میو قوم

تحریر: سکندر سہراب میو

جس قوم نے مادر وطن کو غیروں کی غلامی سے بچانے کے لئے سب سے زیادہ قربانیاں دیں اور جب غداروں کی ضمیر فروشی کے نتیجے میں ملک کو غیروں نے اپنا غلام بنا لیا تو جس قوم نے زنجیر غلامی کو توڑنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان برداشت کیا، جس کی جدی پشتی ملکیتی زمینیں اور جاگیریں انگریزوں نے اس لئے ضبط کر لیں کہ اس قوم نے جنگ آزادی میں انگریزوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا، اس کا ذکر تاریخ میں کہیں نہیں۔ اس قوم کے ہیروز کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ لکھنے والوں کو اس کی قوم کا نام لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ میرا اشارہ میو اور میواتیوں کی طرف ہے۔

۱۸۵۷ء کے غازیوں میں سب سے بڑا نام بھونری کے جنرل بخت کا ہے۔ جو میوات میں بھونری کی پہاڑیوں میں دفن ہے۔ انگریز آخر دم تک جس کا پتہ نہ لگا سکے۔ اگر ہمارے بزرگ ہمیں اس بات سے آگاہ نہ کرتے کہ جنرل بخت میو تھا۔ وہ اور ایک شہزادہ (جسے کسی شہزادی نے یہ کہہ کر اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا کہ جنرل میرا بیٹا آپ کے پاس امانت ہے) بھونری کی پہاڑیوں میں دفن ہیں، اگر ظہیر دہلوی دلّی کا آنکھوں دیکھا حال میں جنرل بخت کا حلیہ ٹھیٹ میو کا بیان نہ کرتا اور عشرت رحمانی اپنی ۵۷ء کی تاریخ میں جنرل بخت کی زبان سے نکلا ہوا ٹھیٹ میواتی زبان کا یہ فقرہ نقل نہ کرتا کہ ''ہم جا کی مونڈی پہ پنہاں دھر دیاں اُو باشادہ بن جاوے'' یعنی ہم جس کے سر پر اپنی جوتی رکھ دیتے ہیں وہ بادشاہ بن جاتا ہے'' تو ہمیں شاید کبھی معلوم نہ ہوتا کہ جنگ آزادی ۵۷ء کا عظیم ہیرو جنرل بخت میو تھا۔ یار لوگ تو اسے بے دھڑک روہیلہ پٹھان لکھتے ہیں۔ اس فقرے سے متعلق واقعہ مختصر یہ ہے کہ جب الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ جیسے غداروں کی سازشوں سے انگریز دہلی پر قابض ہو گئے تو جنرل بخت، بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے پاس گیا اور اسے دہلی چھوڑ کر کسی اور محفوظ جگہ سے لڑائی جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ بادشاہ نے آمادگی ظاہر کی اور اگلے دن ہمایوں کے مقبرے میں ملنے کو کہا۔ انگریزوں نے الٰہی بخش کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ بادشاہ کو انقلابیوں کے ساتھ جانے سے روکے۔ جنرل بخت کے جاتے ہی وہ بادشاہ کے پاس آیا اور بڑھاپے، برسات، بیگمات، شہزادے، شہزادیوں اور سفر کی صعوبتوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ بادشاہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اس پر اس نے یہ وعدہ کیا وہ انگریزوں سے بادشاہ کی صلح کرا دے گا۔ اس پر ایک خواجہ سرا نے کہا ''حضور۔۔ صاحب عالم الٰہی بخش تو انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں، آپ بخت خاں بہادر کی گذارش پر توجہ فرمائیے۔ مرنا اور تکلیف اٹھانا تو زندگی کے ساتھ ہے'' بادشاہ نے اس کے کہے پر توجہ نہ دی۔ الٰہی بخش ہر بات کی اطلاع انگریزوں کو دے رہا تھا۔ حکم آیا کہ جیسے بھی ہو ۲۴ گھنٹے تک بادشاہ کو روکو۔ جنرل بخت اگلے دن بادشاہ کے پاس آیا تو الٰہی بخش بھی موجود تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ بادشاہ ہتھے سے اکھڑنے والا ہے تو اس نے جنرل بخت پر چوٹ کی کہ لارڈ گورنر صاحب لگتا ہے آپ جہاں پناہ کی آڑ میں خود حکومت کرنا چاہتے ہیں'' اس پر جنرل بخت نے غصے میں تلوار کھینچی اور کہا ''ہم جا کی منڈی پہ پنہاں دھر دیواں او بادشاہ بن جاوے ہے''۔

اس پر بادشاہ نے کہا کہ بہادر ہمیں تیری ہر بات کا یقین ہے مگر جسم کی قوت نے جواب دے دیا ہے۔ ہم اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتے ہیں۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو'' جنرل بخت چلا گیا، الٰہی بخش کی مخبری پر ہڈسن فوجی دستے کے ساتھ گرفتار کرنے کے لئے ہتھکڑیاں لے کر آیا تو بادشاہ کی آنکھیں کھلیں کہ اس کے ساتھ دھوکا ہو گیا۔ اس نے کہا، بخت کو بلاؤ مگر تب بخت دور جا چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں دلی کے جنوب میں سرائے لاٹ سے لے کر الور تک اور متھرا سے لے کر نارنول تک میوات تھا۔ یہی وہ علاقہ تھا جو انگریزوں کے لئے قبرستان بن گیا۔ میوات کا ایک ایک گاؤں انگریز کی تربیت یافتہ منظم، جدید ترین اسلحہ سے لیس فوج کے لئے سخت میدان جنگ ثابت ہوا۔ برگیڈیئر جنرل شاور کے الفاظ میں ''مجھ پر ہر اس گاؤں میں حملہ ہوا جہاں سے میں گذرا۔ مجھے دشمنوں کے خلاف لگاتار ہوشیار رہنا پڑا'' میواتی کسانوں نے ہل کے دستہ کی جگہ تلوار کا

دستہ پکڑ لیا اور باز کی طرح فرنگی افواج پر ٹوٹ پڑے پہلے سوہنا اور تاؤڑو کے درمیان ایڈن سے لوہا لیا۔ بعدازاں نوح میں انگریزوں کا صفایا کیا۔ رائے سینا میں کلیوفورڈ کا سر قلم ہونے سے انگریز فوج حیرت زدہ ہو گئی۔ گھاسیڑہ، روپڑا کا، مُہو، فیروز پور، دوہا، پنگواں ہوڈل میں انگریز فوج کو وہ سبق سکھایا کہ انگریز فوج بھی ان کی بہادری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔ لارڈ کیننگ کے الفاظ میں ''میوقوم نے مسلمان بادشاہوں کو بھی تنگ کیا تھا، ہمیں تو کچھ زیادہ ہی پریشان کیا ہے'' اس کے علاوہ اندور، گوالیار، علی گڑھ، الہ آباد، ناگپور، جھانسی، بجنور، بلند شہر اور پیلی بھینت کے میواتیوں نے بھی انگریزوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ اگرچہ پٹیالہ، جیند، نابھا، الور، گوالیار، کوٹہ، میواڑ، مارواڑ اور جنوب کی بیشتر ریاستوں کے حکمرانوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا یا الگ تھلگ رہے، اس کے باوجود ان علاقوں میں باغی عوام کو دبانے کے لئے انگریزوں کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا۔ سکھ، مراٹھے، راجپوت، مغل، ترک، پٹھان، گورکھا، جاٹ اور میو برادری نے بڑی جانبازی دکھائی مگر فرنگیوں کی سیاست، منصوبہ بندی اور جدید ہتھیار ہندوستانیوں پر جتنے بھاری پڑے، اس سے زیادہ غداروں اور قوم فروشوں نے انقلابیوں کی ناکامی اور انگریزوں کی کامیابی میں اپنا گھناؤنا کردار ادا کیا۔ دلی کے جنوب میں واقع اور ہریانہ کے ساتھ مشرقی راجستھان کے الور اور بھرت پور اضلاع میں پھیلے ہوئے میوات کے عوام نے انگریزوں سے ملک کو بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے معروف میواتی شہیدوں میں پنگواں کا سالار صدرالدین جو سقوط دہلی کے بعد بھی کوئی تین ماہ تک انگریزوں کا مقابلہ کرتا رہا، یہاں تک اس کے بیٹے اور پھر خود بھی شہید ہو گیا۔ دلی کا میجر حور خاں، اندور کا سعادت خاں میواتی، الہ آباد کا مولوی لیاقت علی، پیلی بھینت کا علی خاں میواتی، رائے سینا کا علی حسن خاں میواتی، الور کا لعل بہادر خاں میواتی اور بسئی کھوڑ کا کالے خاں توپچی (جس کی توپ کے بے خطا گولوں نے انگریز کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا، جب تک وہ کشمیری دروازے پر ڈٹا رہا، اس کی توپ گولے اگلتی رہی اور انگریزوں کو دلی میں داخل ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ جب غداروں نے اپنے انگریز آقا کے کہنے پر بارود میں رائی، ریت اور پانی ملا دیا اور بارود کی جگہ پالش شدہ باجرہ بھجوایا جانے لگا اور پھر آخر ۷، اگست ۵۷ء کو بارود خانہ جو شمرو بیگم کی حویلی واقع محلہ چوڑی والان میں تھا اڑا دیا گیا تو کالے خاں سمجھ گیا کہ اب سقوط دہلی یقینی ہے وہ بے خطا گولہ انداز مایوس ہو کر اسی رات واپس میوات اپنے گاؤں بڑ میں لوٹ آیا۔ ان غداروں میں بادشاہ کے سمدھی الٰہی بخش، وزیر حکیم احسن اللہ جیسے لوگ شامل تھے جن کو موقع پر پکڑے جانے کے باوجود بادشاہ ہر بار بچا لیتے تھے۔ اس بات نے کالے خاں جیسے بہادروں کو مایوس کر دیا۔ ہندوستان پر قبضہ کے بعد فرنگی حکمرانوں نے انگریز فوج کے افسر دلّی کے اسسٹنٹ کلکٹر کلیفورڈ کی کمان میں کالے خاں کی تلاش میں فوج کا ایک دستہ بھیجا۔ میوات کے قصبہ رائے سینا کے مقام پر آمنا سامنا ہوا۔ بے خبری میں کالے خاں کلیوفورڈ کی گولیوں کا نشانہ بنا مگر زمین پر گرے ہوئے بہادر میو نے اس پر گولی چلائی جو اس کا دل چیرتی ہوئی نکل گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس لڑائی میں کالے خاں دھوکے سے مارا گیا مگر انگریزی فوج کا ایک سپاہی بھی بچ کر نہ جا سکا۔ میوقوم کو اس وطن پرستی کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ ہندوستان میں انگریزوں کی مکمل عملداری کے بعد انگریزوں نے میوات کو نشانے پر رکھ لیا۔ بریگیڈئر جنرل ساورس نے سونا اور تاؤڑو کے علاقوں میں کوئی تین ماہ تک قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اس نے بابر کی طرح میوات میں آگ لگا کر سینکڑوں گاؤں کو خاکستر کیا۔ بابر سے پہلے بلبن کے ہاتھوں میوات کی تباہی تاریخ کا سنگین حادثہ ہے۔ ۵۷ء کی جنگ آزادی میں راسینہ، سوہنہ، تاؤڑو اور نوح میوات میں خصوصی مراکز تھے۔ جہاں انگریزوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ہندوستان پر قبضے کے بعد انگریز سرکار نے دوسرے قصبات کے ساتھ ان کی زمینیں بھی بحق سرکار ضبط کر لیں۔ مکمل عملداری کے بعد راسینہ اور اس کے متعلقہ دیہات نونہرہ، محمد پور، سانپ کی ننگلی، ہریاہڑہ، بائی کی، ہرمتھلہ وغیرہ جو میووں کی بسویداری میں تھے، بحق سرکار انگلشیہ ضبط کر لئے گئے۔ میو آج تک ان دیہات میں بطور مزارع کاشت کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے دیہات کی زمینیں بحق سرکار ضبط کر لی گئیں۔ راسینہ کی بیشتر آبادی پاکستان چلی گئی مگر وہاں بھی ان کو زمینیں نہیں ملیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد یہ سلوک ان لوگوں سے اپنوں کے ہاتھوں ہوا جنہوں نے وطن کی آزادی کے لئے میدان جنگ میں لاکھوں جانیں قربان کیں، ان گنت لوگوں کو پھانسی دے دی گئی۔ بعد میں انگریز سرکار نے کسی مصلحت کے تحت سارا ریکارڈ جلا دیا۔ پھانسی دی جانے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔

انتہائی شرم کا مقام ہے کہ جن غدار، وطن فروشوں کو غداری کے صلے میں جاگیریں ملیں وہ آزادی کے بعد بھی ان کے مالک رہے اور آج بھی ان کی اولادیں ان جاگیروں کی مالک ہیں اور جن وطن پرستوں کی جدی پشتی جاگیروں کو غاصب انگریز اپنے زرخریدوں کو دے گیا وہ آزادی کے بعد بھی ان کو لوٹائی نہ گئیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ جن وطن پرستوں سے انگریزوں نے ان کی جائیدادیں چھینی تھیں، آزادی کے بعد نہ صرف یہ کہ ان کی جائیدادیں ان کو واپس کی جاتی بلکہ ان کی قربانی کے صلے میں ان کو مزید انعام سے نوازا جاتا اور غداروں سے ان کے ناجائز آقاؤں کی بخشی گئی جائیدادیں چھین لی جاتیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہی نہیں میوات کو پنجاب اور راجستھان میں بانٹ

دیا گیا۔ بعدازاں پنجاب کی جگہ ہریانہ نے لے لی۔ میوات کے علاقہ کو الور اور بھرت پور ریاستوں نیز گوڑ گانواں اور متھرا ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ دلّی کے دیہی علاقے کے سیکڑوں دیہات کو اجاڑ دیا گیا۔ بعدازاں وائسرائے ہاؤس کی تعمیر کے بہانے پانچ چھ گاؤں کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ ان کی زرعی زمینوں پر آر کے پورم، ساؤتھ ایکس ٹینشن اور کناٹ پیلس کو بسا دیا گیا۔ اردگرد کے سینکڑوں گاؤں کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ میووں کو میوات سے باہر لے جا کر پھانسیاں دی گئیں اور بعد میں ریکارڈ جلا دیا گیا۔ میو مجاہدین کی بہادری کو انگریزوں نے تو تسلیم کیا ہے جنکے خلاف وہ لڑے مگر ہندوستانی مورخوں کو ان پر تحقیق اور تحریر کی توفیق نہ ہوئی۔ مجاہدین کے پورے کے پورے گاؤں جلا دیے گئے، زمینیں بحق سرکار ضبط کر لی گئیں جو آزادی کے بعد ان کو واپس نہیں کی گئیں۔ دونوں ملکوں میں مجاہدین آزادی کے ساتھ جو سلوک ہوا کیا وہ وطن فروشی اور غلامی کی ترغیب دینے کی طرح نہیں۔ دوبارہ تقسیم کیا جانے والا میوات آج تک تقسیم کے اس درد سے تڑپ رہا ہے۔ میو قوم کی جن قربانیوں کی تاریخ لکھنے کے لئے ہزاروں صفحات بھی کم پڑتے ہوں ان کو خورشید مصطفٰے زیدی اپنی کتاب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں چند سطروں میں یوں بیان کر کے اپنا فرض ادا کر دیتا ہے: ''شہزادے (فیروز شاہ) کے ساتھی ۶، اکتوبر کو آگرہ میں داخل ہوئے مگر چار دن بعد دہلی سے انگریزی فوجیں گرتیہڈ کی رہنمائی میں پہنچیں اور انقلابیوں کو منتشر ہونا پڑا۔ فتح پور سیکری کا سردار لال خاں میواتی بھی کہا جاتا ہے کہ شہزادے سے آملا تھا۔ فتح پور سیکری کے میواتی کافی عرصہ تک بغاوت کرتے رہے۔ بالآخر فتح پور سیکری جلا دیا گیا اور ۴ فروری ۱۸۵۸ء کو آخری پارٹی نکالی جا سکی۔ میواتی تباہ کر دیے گئے''

۹، ستمبر ۱۸۵۷ء سقوط دہلی سے ۴ فروری ۱۸۵۸ء تک تقریباً ۵ مہینے بنتے ہیں۔ گویا میو دہلی پر قبضہ ہونے بعد بھی ۸، ۹ مہینے تک انگریزوں کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ کیونکہ آگرہ کے بعد بھی میو اندرون میوات انگریزوں سے برسرپیکار رہے۔ یہ معمولی بات نہیں۔ میو قوم کا جرم اپنی مٹی سے محبت اور غلامی سے نفرت ہے۔ جس کی سزا وہ آج تک پا رہی ہے۔ بھارت سرکار نے میوات کو ادھر ادھر کے علاقوں میں بانٹ کر اسے بے نشان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک چھوٹا سا علاقہ جسے ضلع میوات کا نام دے کر میو قوم کی اشک شوئی کی گئی تھی، سنا ہے مودی سرکار کو یہ نام بھی چبھنے لگا ہے اور میوات کی بجائے اسے کوئی اور نام دینے کی سازش کی جا رہی ہے۔

الحذر اے چیرہ دستاں الحذر۔

❁❁❁

دلوں سے نکلی آہوں کا اثر دیکھ رہے ہیں

(ریاض احمد ملک دوالمیال ضلع چکوال)

مظلوموں کی آہوں کا اثر دیکھ رہے ہیں
قربِ مولا کے نظاروں کا اثر دیکھ رہے ہیں

خوفِ خدا میں ڈوبے سجدوں کا اثر دیکھ رہے ہیں
اشک برساتی اپنی نگاہوں کا اثر دیکھ رہے ہیں

نیم شب کی کرب اور درد و الم میں ڈوبی
اسیران ، آقا کی دعاؤں کا اثر دیکھ رہے ہیں

ابتلاؤں اور آزمائشوں میں جوش و جنوں میں ابھری
دلوں سے برپا سسکیوں کا اثر دیکھ رہے ہیں

ہر لمحہ ، ہر لحظہ، شام و سحر محمد مصطفیٰ ﷺ پر بھیجے
اسیران ، درود و سلام کا اثر دیکھ رہے ہیں

عشقِ مصطفیٰ ﷺ میں ڈوبی رات کو پچھلے پہر
دلوں سے نکلی آہوں کا اثر دیکھ رہے ہیں

عزم و ہمت اور رقعت میں ڈوبی دعاؤں سے
غفور و رحیم خدا کی رحمت کا اثر دیکھ رہے ہیں

بھنور میں ڈال کر اپنی دعاؤں کی ناؤ کو
ریاضؔ عشق کے ساگر کا اثر دیکھ رہے ہیں

❁❁❁

دنیا کی تاریخ کا سب سے ظالم بادشاہ

لندن (مانیٹرنگ ڈیسک) قدیم زمانے کی جنگوں میں فتوحات کے بعد دشمنوں کے سر قلم کرنا تو عام روایت تھی لیکن لگ بھگ ساڑھے 600 عیسوی قبل مسیح میں موجودہ شام و عراق پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا جو دشمنوں کو ایسی ہولناک سزا دیتا تھا کہ سن کر ہی انسان کانپ اٹھے۔ میل آن لائن کے مطابق اس بادشاہ کا نام اشربنی پال (Ashurbanipal) تھا، جس کی سلطنت موجود مصر سے ایران تک پھیلی ہوئی تھی۔

653 قبل مسیح میں ہمسایہ سلطنت 'ایلم' (Elam) کے بادشاہ تیومن (Teumman) سے ایک متنازعہ علاقے پر اس کی جنگ ہوئی۔ جنگ میں اشربنی پال کو فتح حاصل ہوئی اور تیومن، اس کے بھائی، سپہ سالار وغیرہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس فتح پر عراق کے قدیم شہر 'نینوا' میں واقع اشربنی پال کے محل میں ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا گیا۔ نینوا کا موجودہ نام موصل ہے جو اس وقت اشربنی پال کی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ اشربنی پال نے پہلے تو تیومن کو گھوڑوں کی جگہ اپنی بگھی میں جوت دیا اور وہ پورے نینوا میں اس کی بگھی کو کھینچتا رہا اور لوگ یہ نظارہ دیکھتے رہے۔ پھر اس کا سر قلم کر کے کئی ہفتے کے لیے شہر کے مرکزی دروازے پر لٹکا دیا گیا، تاکہ اشربنی پال کے دشمن اس سے عبرت حاصل کریں۔ اشربنی پال نے تیومن کے بھائی کا سر قلم کر کے اس کی لاش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیئے تھے اور یہ ٹکڑے پوری سلطنت میں فتح کی یادگار کے طور پر تقسیم کیے گئے۔ سب سے ہولناک سزا اشربنی پال نے سلطنت ایلم کے سپہ سالار کو دی۔ اس نے سپہ سالار کی زندہ کھال کھنچوا دی۔ یہ اشربنی پال سمیت اس سلطنت کے تمام بادشاہوں کی طرف سے دشمنوں کو عام دی جانے والی سزا تھی۔ وہ اپنے دشمنوں کی زندہ کھال کھنچواتے اور یا تو انہیں سوروں کے آگے ڈال دیتے اور وہ انہیں اپنی خوراک بنا لیتے، یا پھر انہیں کتوں کے ساتھ رہنے پر مجبور کر دیا جاتا۔ اشربنی پال اس سلطنت کا آخری بادشاہ تھا، جو صدیوں سے قائم تھی۔ اشربنی پال کی موت 627 عیسوی قبل مسیح میں ہوئی اور اس کی موت کے ساتھ ہی اس سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

سبز و سیاہ چائے میں بلڈ پریشر کے خلاف نئے اجزاء دریافت

کیلیفورنیا: سبز اور سیاہ چائے میں پہلے سے موجود دو کیمیائی اجزا کے متعلق انکشاف ہوا ہے کہ وہ بلڈ پریشر کو معمول پر رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

یونیورسٹی آف کیلیفورنیا (یو سی ایل)، اِرون کے سائنسدانوں نے کہا ہے کہ دونوں طرح کی چائے میں ایسے کیمیکل موجود ہوتے ہیں جو خون کی رگوں میں آئن چینل پروٹین کو سرگرم کر کے نسوں اور رگوں کو آرام کی صورت میں رکھتے ہیں اور اس طرح بلڈ پریشر بڑھنے کو روکتے ہیں۔

اس طرح بلڈ پریشر معمول پر رکھنے والی نئی ادویہ کی تیاری کی راہیں بھی کھلیں گی۔

یو سی ایل میں فزیالوجی کے شعبے سے وابستہ ڈاکٹر جیفرے ایبٹ اور ان کی ساتھی کیٹلن ریڈفورڈ، نے کہا ہے کہ چائے میں کیٹا چن قسم کے دو عدد فلے وینوئڈ پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خون کی نالیوں میں موجود 'کے سی این کیو فائیو' نامی آئن چینل کو سرگرم کرتا ہے۔ یہ پروٹین ہموار پٹھوں کے اندر بکثرت ہوتا ہے جہاں خون کی چھوٹی بڑی رگیں بھی موجود ہوتی ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ چائے کے مخصوص اجزا، 'کے سی این کیو فائیو' چینل کو تیزی سے کھولتے ہیں۔ اس طرح رگیں سکڑتی نہیں اور خون کا بہاؤ ہموار انداز میں جاری رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس چینل کو سرگرم کر کے بلڈ پریشر میں اضافے کو قابو کیا جا سکتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ شاید چائے کے یہ دونوں اجزاء خون کی رگوں کو اس لحاظ تک بہتر رکھتے ہیں کہ اس سے مرگی اور دماغی امراض میں کمی بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ تاہم ان کا اصرار ہے کہ سیاہ چائے میں دودھ یا پاؤڈر نہ ڈالا جائے بلکہ اسے قہوے کی طرح ہی استعمال کیا جائے۔

مخدوم محمد زمان "طالب المولیٰ"

تحریر: عبدالعزیز سندھ

سندھی زبان کے مشہور ادیب اور شاعر مخدوم محمد زمان 4 اکتوبر 1919ء کو پیدا ہوئے۔ مخدوم محمد زمان کے والد کا نام مخدوم غلام محمد تھا۔ آپ کی پیدائش "ہالا" میں ہوئی جو سندھ کا مشہور شہر ہے۔ آپ حضرت مخدوم نوح رحمۃ اللہ علیہ کی نسل میں سے تھے اور ہالا میں واقع مخدوم نوح سرور کے مزار کے سترہویں سجادہ نشین تھے۔ مخدوم نوح رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے صوفی بزرگ ہوگزرے ہیں۔ آپ 16 دسمبر 1944ء کو اپنے والد مخدوم غلام محمد کے انتقال کے بعد درگاہ کے سجادہ نشین بنے۔ مخدوم صاحب نے اپنی شاعری کی شروعات جنوری یا فروری 1934ء میں کی۔ آپ نے سندھی زبان کے ساتھ ساتھ اُردو زبان میں بھی شاعری کی۔ آپ کی مشہور تصانیف میں امام غزالی جا خطوط، خودشناسی، بہار طالب، رباعیات طالب، چھپر میں چھڑیوں، شان سروری، دیوان طالب المولیٰ، سندھ جو شکار، سماع العاشقین فی سرور الطالبین اور آب حیات شامل ہیں۔ آپ نے سندھ میں صحافت کی سرپرستی بھی کی اور ہفت روزہ پاسبان، الزمان، کوثر، اور تعمیر نامی اخبارات جاری کئے۔ ادبی رسالوں میں ماہنامہ فردوس اور روح ادب جاری کئے۔ آپ کی شاعری میں سے کچھ بطور نمونہ درج ذیل ہے:

مرا غمخوار تو خلوت گزیں ہے
مرا دنیا میں اب کوئی نہیں ہے
تیرا کوچہ بنایا اپنا مسکن
کہ عاشق کا یہی خلد بریں ہے
سمجھتے ہیں جسے سب لامکانی
وہ میرے خانہ دل میں مکیں ہے
یہ "طالب" مل نہیں سکتا کسی سے
غم دلبر میں اب خلوت نشیں ہے

یاد رہے کہ "طالب المولیٰ" مخدوم محمد زمان کا لقب تھا جس کا استعمال وہ اپنی شاعری میں بھی کرتے تھے اور نثر میں بھی۔ شاعری میں آپ نے پہلے بیوس (جسے اردو میں بے بس کہا جاتا ہے)، بعد ازاں فراقی، زمان شاہ اور طالب اور بالآخر 1949ء میں طالب المولیٰ کا تخلص اختیار کیا۔ مخدوم صاحب آخری زمانہ کے مسلمانوں کے حالات دیکھ کر تڑپ اُٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

یارب! یہ آج دورِ مسلماں کو کیا ہوا
رسوائی بڑھ گئی ہے شبستاں کو کیا ہوا
چھائی ہے آج گلشن مسلم پہ کیوں خزاں
سرسبز و پر بہار گلستاں کو کیا ہوا
اقوام ِ غیر آج کیوں غلبہ پذیر ہیں
افسوس اپنی ہمت جولاں کو کیا ہوا
وہ جوش، وہ امنگ نہیں آج قوم میں
غیرت گئی دلوں سے یہ ایماں کو کیا ہوا
ہر ذرہ تیرے اذن کا محتاج ہے اگر
کیوں دیر ہوگئی، تیرے درماں کو کیا ہوا
(طالب) کے دل میں رہتا ہے ہر وقت یہ ملال
بس آرزو ، اطاعت قرآن کو کیا ہوا۔

آپ کو شاندار علمی و ادبی خدمات پر حکومت پاکستان کی جانب سے (تمغہ پاکستان) اور (ہلال امتیاز) سے نوازا گیا جبکہ آپ کو "لطیف ایوارڈ" بھی دیا گیا تھا۔ مخدوم محمد زمان (طالب المولیٰ) نے 11 جنوری 1993ء کو کراچی میں وفات پائی اور ہالا میں آپ کی تدفین ہوئی۔

لاہور انٹرنیشنل رسالہ کی توسیع اشاعت میں حصہ لینا آپ کا قومی فرض ہے۔